چالیس کروڑ بھکاری

افسانوں کا مجموعہ

از

ابراہیم جلیس

نفیس اکیڈیمی

عابد روڈ حیدرآباد دکن

قیمت تین روپیے چار آنہ مجلد

قیمت دو روپیے بارہ آنہ

طبع اول ——— ایک ہزار جون ۱۳۴۵ء

طبع دوم ——— ایک ہزار۔ اگست ۱۳۴۶ء

مطبوعہ

انتظامی پریس حیدرآباد دکن

فہرست

ساحر لدھیانوی کے نام ـــــــــــ

چالیس کروڑ بھکاری

اپنی نئی نویلی بیوی کی عجیب و غریب خواہش سے جان ڈلف کچھ بیزار سا ہو گیا تھا۔ اس نے اس کو امریکہ کے علاوہ برّاعظم یورپ میں سوئٹزرلینڈ، لمباڈی، نارمنڈی اور ساحل پرتگال کے سارے شبستانوں کی سیر کرائی تھی لیکن اس کی خوبصورت ضدی بیوی کو تو جیسے خبط ہو گیا تھا کہ تاج محل دیکھوں گی ۔

جان ڈلف نیو یارک کا سب سے بڑا بینکر تھا۔ اپنی بیوی کو تاج محل دکھانا تو اس کے لئے بہت ہی معمولی سی بات تھی۔ لیکن وہ ہندوستان کے نام سے گھبراتا تھا۔ اس نے انگریز اور امریکی سیاحوں کے بیسیوں سفرنامے پڑھے تھے کہ ہندوستان ایک بہت ڈراونا، ہیبتناک اور اندھیرا ملک ہے ——— اونچے اونچے ہیبتناک پہاڑوں سے گھرا ہوا، گھنے گھنے جنگلوں سے تاریک جہاں دن کے وقت بھی رات کا دھوکا ہوتا ہے ——— جیسے ساری دنیا کی رات طلوعِ آفتاب کے بعد ہندوستان میں پناہ لیتی ہو۔ گویا ہندوستان ہی ساری دنیا کی تاریکیوں کی پناہ گاہ ہے۔ ہندوستان کا باشندہ ابھی جانور ہی سا ہے۔ اس نے سفرناموں، تاریخوں اور جغرافیہ کی کتابوں میں ہندوستانی باشندے کی تصویر بھی دیکھی تھی کالے موٹے چمڑے، سخت بالوں، موٹے ہونٹوں

خونخوار دانتوں اور ڈراؤنی شکل والا جس کے بالوں سے بھرے ہوئے چوڑے چکلے سینے پر ایک بڑا زہریلا سانپ یوں لہراتا رہتا ہے۔ جیسے دلفت اپنے گلے میں مفلر اسکارف یا نکٹائی باندھا کرتا ہے۔

بعض ہندوستانیوں کو اس نے یورپ کی یونیورسٹیوں ہوٹلوں ریستورانوں قحبہ خانوں اور ریل گاڑیوں میں دیکھا تھا جو امریکیوں اور انگریزوں کی طرح کپڑے پہننے لگے تھے، ٹوٹی پھوٹی انگریزی بھی بول لیتے تھے۔ ان کی کالی ڈراؤنی شکلوں، لباس کی بدسلیقگی اور انگریزی بولتے ہوئے مضحکہ خیز لہجے کو سن کر وہ اپنی بیوی سے کہتا —— صرف دُم کی کسر ہے! وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح اس کی بیوی کو ہندوستان سے نفرت ہو جائے اور وہ تاج محل دیکھنے کا خیال ہی چھوڑ دے۔

لیکن جب تک مرد کی پسلی سے عورت پیدا ہوتی رہے گی اور عورت کے پہلو میں جب تک عورت کا دل ہے۔ تاج محل عورت کی آنکھوں کے آگے جگمگاتا ہی رہے گا۔ عورت کہیں کی ہو کسی رنگ کی ہو۔ وہ تاج محل کو کبھی نہیں بھول سکتی اور خصوصاً جب کہ دلفت کی بیوی فنش نیویارک کے تمام کلبوں اور ناچ گھروں میں بڑی رومانٹک اور آرٹسٹک طبیعت کی عورت سمجھی جاتی تھی۔ اس کی آنکھیں ایسی متناسب حسین قوسوں سے بنائی گئی تھیں جیسے تاج محل کے سفید گنبد کے قوس حسین اور متناسب ہیں۔ ان چمکیلی آنکھوں کے آگے اندھیرا تو خواب میں بھی نہیں بھٹکتا کہ تاج محل نظروں سے اوجھل ہو جائے۔ اب بھلا وہ تاج محل کو کیسے بھلا دے —— !

دلفت اکثر اپنی بیوی سے کہتا۔

"مائی فش ڈارلنگ ——— ارے تاج محل تو کچھ بھی نہیں یہ ہماری چالیس منزلہ بلڈنگ تو تاج محل سے بھی زیادہ اونچی ہے۔ دیکھو تو سب سے اوپر کی بالکونی جیسے آسمان کی نیلاہٹوں میں گھس گئی ہے۔ شام کی شفق کا سارا لاکھا بالکونی کو دلہن کی طرح سنوار رہا ہے۔ رات کے وقت نیچے سے دیکھو تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ستارے اسی بالکونی سے نکل نکل کر سارے آسمان پر پھیل گئے ہیں ڈارلنگ ——— اب تاج محل کو بھول جاؤ اور مجھے ایک بوسہ دیدو ......"

——— چم چچاچ ——— یا فش اس کو بوسہ دیدیتی۔ لیکن اس کو ایسا محسوس ہوتا جیسے چالیس منزلوں کے اوپر آسمان کی نیلاہٹوں میں گھسی ہوئی بالکونی میں محبت کی دیوانگی سے ابلتے ہوئے ... چم چچاچ ... بوسے میں کوئی مزا ہی نہیں ہے۔ بوسہ تو ممتاز محل کی قبر ہے جو بوسے کے لئے بیقرار ابھرے ہوئے بھینچے ہوئے ہونٹوں کی طرح شاہجہاں کی منڈلاتی ہوئی روح کو چوم رہی ہے۔ فش ——— وہ صد درجہ رومانٹک اور آرٹسٹک مزاج والی فش ——— اسی بوسے کی لذت کو اپنی نظروں کے لمس سے محسوس کرنے کے لئے بیقرار تھی۔

دلفت ٹالتا رہا ——— ٹالتا رہا۔ لیکن ایک ششماہی پر جبکہ بینک کا

منافع پچھلی ششماہی سے بھی دو تہائی زائد وصول ہوا۔ فش مچل گئی۔ منہ بسور کر نچلا ہونٹ لٹکائے اپنی سڈول بھری بھری پنڈلیوں کو سکیڑے، پلنگ میں گھسی ہی رہی۔ مگر اس کی آنکھوں میں تاج محل کے حسین تصور سے ایسا حسن جھلک آیا تھا کہ ولف نے اس کی آنکھوں سے آنکھیں ہٹائے بغیر اپنے سکریٹری سے کہدیا کہ وہ کل ہی ہندوستان روانہ ہو جائے گا۔

× × × × × ×

× × × × × ×

دوسرے دن جب وہ ہندوستان کے لئے روانہ ہو رہے تھے تو بندرگاہ پر ولف کی ماں۔ فش کے باپ اور دوسرے عزیزوں اور دوستوں نے ساتھ ساتھ آٹھ آٹھ فائر والی پستولیں اور بندوقیں انھیں دیتے ہوئے نصیحت کی کہ ہندوستان بڑا خطرناک ملک ہے ــــــ بڑا گھنا جنگل ـــ قدم قدم پر چوکنے رہنا جنگلی جانوروں کے علاوہ وہاں کے باشندے بھی ایسے آدم خور ہوتے ہیں کہ سفید چمڑی والے کو بھی چیر پھاڑ کر کھا جاتے ہیں۔

فش نے نہ ان پستولوں اور بندوقوں کو دیکھا اور نہ وہ نصیحتیں سنیں وہ تو اپنے تصور کی ہلکی ہلکی چاندنی میں تاج محل کے مرمریں گنبد اور مینار دیکھ رہی تھی اور اس کے کانوں میں اُس دوامی، لافانی بوسے کی لذت آگیں آواز منجمد ہو گئی تھی جو ممتاز محل کی قبر اور شاہجہاں کی بیقرار روح کے بیچ چپکا ہوا تھا۔

× × × × × ×

× × × × × ×

دلف اور فش بالآخر ہندوستان پہنچے۔ جس وقت بمبئی کی بندرگاہ میں ان کا جہاز داخل ہوا۔ اس وقت اتنی سخت دھوپ اور گرمی کی لپٹیں جہاز سے ٹکرا رہی تھیں کہ پسینے کے مارے فش کے گالوں کا سب پاؤڈر ڈھل جاتا تھا دلف نے تنگ آکر اور اپنی امریکی پریسٹیج کو دھتکار کر نکٹائی ڈھیلی کر لی قمیص کے بٹن کھول دیئے۔ فش بھی جہاز سے اترنے سے پہلے بڑی دیر تک باتھ روم کے ٹب میں لیٹی رہی۔ اترتے وقت اس نے اپنے سرخ رخساروں پر کریم اور پاؤڈر کی دوہری تہہ جمائی ایسے جیسے شراب ناب کو دو آتشہ و سہ آتشہ بنایا جاتا ہے۔

جہاز کی سیڑھی سے اترتے ہوئے فش نے دلف سے کہہ ہی دیا۔
ڈارلنگ ــــــ ہندوستان کے بجائے راستہ بھول کر ہم کہیں دوزخ میں تو نہیں آ گئے؟"
دلف نے موقع پا کر فش پر طنز کیا ــــــ
مائی سویٹی ــــــ اسی دوزخ کی سیر کے لئے تو تم بیقرار تھیں ــــــ مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں یہاں زندہ نہ رہ سکوں گا۔"
فش نے برا مان کر دلف کے گال پر اپنا ہاتھ ندامت سے رکھتے ہوئے بڑی لجاجت سے کہا۔
فار گاڈس سیک ڈیر ــــــ ڈونٹ اٹر سچ بیڈ اومن
خدا کے لئے ایسی بدفالیں زبان سے نہ نکالو۔

دلف کچھ کہنا چاہتا تھا۔ لیکن کالے کالے مسٹنڈے، دو دو بالشت کی لنگوٹیاں لگائے ہوئے آدمیوں کے ایک گروہ نے انھیں گھیر لیا۔ دلف اور فش تماشہ دیکھتے رہے کہ کس طرح یہ مسٹنڈے ان کے سوٹ کیسوں، ہولڈالوں اور ٹرنکوں کو اٹھانے کے لئے آپس میں لڑ رہے تھے۔

آخر دو مسٹنڈوں نے ان کا سارا سامان اپنے کندھوں پر لاد لیا۔ فش کو بہت تعجب ہو رہا تھا۔ اتنا بہت سارا بوجھ! اور صرف دو آدمیوں نے اٹھا لیا ——— ! مگر اس میں تعجب کی بات ہی کیا تھی۔ یہ بیچارے تو عرصے سے بوجھ اٹھا رہے ہیں۔ بوجھ اٹھانے کے عادی ہو چکے ہیں! یہ ٹرنکوں، سوٹ کیسوں اور ہولڈالوں کا بوجھ بھی کوئی بوجھ ہے! یہ تو زندگی کا ماضی کا، تاریخ کا بوجھ صدیوں سے اپنے کمزور کندھوں پر اٹھائے ہوئے ہیں۔

فش غور سے اس قلی کے کالے ننگے گٹھیلے جسم کو بھرپور نگاہوں سے دیکھ رہی تھی ——— صرف ایک بالشت بھر کا چیتھڑا اس کی کمر سے لٹکا ہوا تھا۔ اس کے بازوؤں، سینے، رانوں، پنڈلیوں پر بار بار پھڑکتے ہوئے مسلس کو دیکھ دیکھ کر اسے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے یہ جسم گوشت سے نہیں بنا ہے بلکہ کالے پتھر کی چٹان سے تراشا گیا ہے۔ اس کے جسم میں دلف کے جسم کی طرح بادی ہی بادی نہیں بھری ہے۔ بلکہ پتھر ——— طاقت بھری ہوئی ہے۔ فش طاقت کی بڑی دلدادہ تھی۔ یوں تو ہر عورت طاقت کی دلدادہ ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ فش کا باپ ایک مشہور ریزلر (WRESTLER) تھا۔ اس سے اپنے باپ کی طرح وہ ہر ریزلر یعنی ہر طاقتور سے محبت کرنے لگی تھی ——— یعنی

پسندیدہ نظروں سے دیکھتی تھی۔ کسی کو پسندیدہ نظروں سے دیکھنا بھی تو محبت ہی ہے ـــــ ادنیٰ درجے کی محبت ہی ہی ـــــ اس قلی کا جسم بھی اس کے باپ کی طرح بھرا بھرا تھا۔ گٹھیلا۔ اس کا رنگ کالا تھا تو کیا ہوا ـــ فلش نے سوچا۔ اس کی عورت کتنی آسودہ ہوگی اس سے ـــ ! پھر فلش نے لاشعوری طور پر اس مزدور کو گھورتے گھورتے شوہر کی طرف دیکھا ـــــ پھر شوہر کو بھی گھورنے لگی۔ لیکن بہت ہی جلد اس نے جی ہی جی میں اپنے آپ کو ملعون کیا کہ وہ ایک ذلیل مزدور سے اپنے کروڑپتی شوہر کا مقابلہ کر رہی ہے۔ ایک غلام کا آقا سے ـــــ ایک کالے کا گورے سے تقابل ـــــ اس کی امریکی رگِ حمیت بھڑک اٹھی۔ اس کی نظریں شوہر کے چہرے پر ملائم ہونے لگیں۔ اس کے شوہر کا قصور کیا ہے؟ وہ بیچارہ تو دن بھر بینک کی گدیلی کرسی پر بیٹھا رہتا ہے۔ بینک سے باہر آیا تو موٹر کے اسپرنگ دار لچکیلے گدے میں دھنس گیا گھر پہنچا تو وہی مونڈھے، صوفے، گدے، بستر۔ کھانا تو وہ کروشن سالٹ کے بغیر ہضم ہی نہیں کر سکتا تھا جسم میں بادی نہ بھرے گی تو کیا بھرے گی ـــــ ہاتھ پاؤں، سینہ، پیٹ، رانیں سب تھل تھل پل پل ـــــ مگر عورت تھل تھل پل پل جسم کو پسند نہیں کرتی ـــــ عورت کا جسم گداز ہوتا ہے اور گداز اور تھل تھل پل پل جسم میں تفاوت راہ از کجا است تا بہ کجا والی بات ہوتی ہے یعنی تھل تھل پل پل اور گداز جسم دونوں کے دونوں منفی اور کتنی مجبوری کی بات ہے کہ منفی منفی کی طرف رُخ ہی نہیں کرتا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک ریاضی دان نے تو دنیا کی ساری تخلیقات کا منبع اسی فارمولے کو بتایا ہے چونکہ فلش کی شادی کو

ڈیڑھ سال کا عرصہ ہو چکا تھا۔ اور اس کا جسم ابھی تک گداز تھا ——— یعنی منفی تھا۔ اسی لئے مثبت سے ٹکرانے اور اس میں مدغم ہو جانے کا ایک خیال ——— خواہ وہ خیال ناپاک ہی کیوں نہ ہو۔ فش کے ذہن میں آجائے تو وہ اتنی ہی بے قصور تھی جتنی وہ خوبصورت تھی اور فش کی عمر ابھی کیا تھی ——— ؟ چوبیسواں ابھی ابھی ختم ہوا تھا پچیسواں لگا تھا۔ اور شیطان تو جب سے مندروں اور مسجدوں اور گرجاؤں سے دھتکار کر نکال دیا گیا ہے۔ نوجوان دماغوں میں چھپتا چھپاتا زندگی کے دن گذار رہا ہے ——— شاید اس لمحے چھپنے کے لئے فش کے دماغ میں آ گھسا تھا۔ لیکن جلد ہی اس نے شیطان کو اپنے دماغ سے بھگا دیا۔ اور اپنے شوہر کے ہاتھ کو اپنی بغل میں دبا کر یوں چلنے لگی جیسے دونوں کی رُوح جدا جدا ہے اور نہ جسم۔

وہ ابھی تھوڑی دور نہ گئے تھے کہ ایک اونچا پورا اس کے شوہر سے بھی لمبا تڑنگا نوجوان لڑکا ان کے قریب آیا۔ وہ ایک سرمئی رنگ کی پتلون اور میلا سفید قمیص پہنے ہوئے تھا۔ سر کے بال بکھرے ہوئے۔ لمبوترا چہرہ جو ہندوستان کی دھوپ سے تپ تپ کر سنولا گیا تھا۔ لیکن اس کی آنکھیں بڑی بڑی اور چمکیلی تھیں۔ فش تو اس لڑکے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ ہی نہ سکی کتنی چمک تھی ان آنکھوں میں ——— اکتنی باتونی تھیں وہ آنکھیں ——— اصاف صاف کہہ رہی تھیں کہ میں بھوکا ہوں ——— میں پیاسا ہوں ——— میں غریب ہوں ——— اگر مجھے اس وقت روٹی کے بدلے عورت بھی مل جائے تو میں اسے بھی ڈبل روٹی کی طرح کھا جاؤں ——— !"

اس نے انگریزی میں دلف سے پوچھا۔

"یو وانٹ گائیڈ سر —————— ! رہبر کی ضرورت ہے صاحب؟"

دلف نے سگریٹ کا کش لیتے لیتے رک کر کہا۔

"یس یس —————— شیور! یہاں رہنے کے لئے کوئی ایسی ہوٹل بتاؤ جو ہم امریکیوں کے شایان شان ہو۔"

لڑکے نے کہا......

"تاج محل ہوٹل یہاں کی بہترین ہوٹل ہے۔"

دلف کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"تاج محل —————— ! یہ ہوٹل ہے؟"

لڑکا ہوشیار تھا فوراً سمجھ گیا۔

"تاج محل ہوٹل بھی ہے اور تاج محل......"

لڑکا ہنسنے لگا اور بولا۔۔

ہندوستان میں ایسا ہی ہوتا ہے مادام! یہاں اچھے نام کی بہت کمی ہے۔ یہاں ہر اچھی چیز کی کمی ہے۔ تاج محل مجسمہ کا ایک مقبرہ تو اب بھی ہے۔ تاج محل میری جیب میں لگی ہوئی پنسل کا بھی نام ہے۔ ایک ہیر کٹنگ سیلون کا نام بھی تاج محل ہے۔ تاج محل میلے کپڑے دھونے والی ایک لانڈری کا بھی نام ہے ——————"

لڑکا پھر ہنسنے لگا۔ دلف کو اس لڑکے کی گفتگو کا انداز بڑا مزیدار لگا۔

معلوم ہوا ایسی دلچسپ گفتگو اور دلآویز ہنسی غماز تھی کہ لڑکے نے اپنی زندگی کو بہت زیادہ کتابوں کی مدد سے سمجھا ہے۔ فش نے اس میں دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

"تمہاری باتیں بڑی دلچسپ ہیں۔ تم طالب علم تو نہیں ہو"

لڑکے نے بائیں گال میں اپنے موٹے موٹے ہونٹوں کا ایک طنزیہ خم پیدا کرتے ہوئے کہا ———

"ہاں کبھی طالب علم تھا ——— لیکن اب جہالت کا طالب ہوں۔ علم فضول سی چیز ہے! بے علمی کی نعمت سے میں محروم ہوں اس کا مجھے بہت افسوس ہے"

فش نے حیرت سے پوچھا۔

"ڈاٹ! ——— تم کیا کام کرتے ہو۔ تم نے کہاں تک تعلیم پائی ہے؟"

لڑکے نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بی۔ اے کی ڈگری لی تھی۔ ڈیڑھ روپیہ خرچ کرکے اس کو ایک خوبصورت فریم میں لگوایا تھا لیکن اب اس ڈگری پر اسی فریم میں نرگس کی تصویر لگادی ہے۔ نرگس یہاں کی فلم ایکٹرس ہے مادام ——— خوبصورت کیا اچھی ہے نہیں؟ مجھے کچھ کچھ پسند ہے ———"

فش ایک عجیب مسکراہٹ اور تعجب بھری نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھی۔ لڑکا اس کی نظروں کا مفہوم سمجھ گیا اور بولا۔

میں یہاں یونہی تقریباً ہر جہاز کے وقت آجاتا ہوں۔ اگر کوئی بیرونی سیاح یہاں آتے ہیں تو ان کو گائیڈ کرتا ہوں ــــ میری تعلیم نے یہی سکھایا ہے کہ خود بھٹکتے رہو۔ لیکن بیرونی سیاحوں کو ہندوستان کی ایک ایک گلی کا پتہ بتادو

فش نے پوچھا۔

تم پروفیسر وکیل یا سویلین کیوں نہیں بن گئے

لڑکے نے جواب دیا۔

میں نے اپنی یونیورسٹی میں پروفیسری کی درخواست دیدی تھی لیکن اسی عرصے میں مسٹر فیلڈن انگلستان سے آگئے۔ وکیل اس لئے نہیں بنا کہ لوگ بیرسٹر کی عزت کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ ولائت سے آتا ہے۔ سیویلین اس لئے نہیں کہ میری رگوں میں ایک غریب باپ کا خون ہے۔

فش نے کہا ــــ

عجیب آدمی ہو تم ــــ تمہاری باتیں سن سن کر تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں کسی افسانے یا ناول کے جیتے جاگتے ہیرو سے باتیں سن رہی ہوں ــــ اچھا اب چلو ــــ ہمیں ہوٹل تک پہنچادو۔"

لڑکا مسکراتا ہوا گیا اور تھوڑی دیر بعد ایک ٹیکسی لے آیا جس میں بیٹھ کر وہ تاج محل ہوٹل گئے۔

فش اس لڑکے میں اتنی دلچسپی لینے لگی تھی کہ اس نے دلفن کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ ہندوستان کے سفر میں ان لوگوں کے ساتھ ہمیشہ رہے وہ انگریزی جانتا ہے۔ یہاں کی تاریخ و جغرافیہ سے بخوبی واقف ہے اس کے معاوضے میں اسے کچھ ـــــ یعنی روپے دیدیئے جائیں۔ دلفن کیسے انکار کرتا۔ وہ تو فش کی میٹھی زبان کے سحر سے ایسا مسحور تھا کہ وہ ہندوستان سے نفرت یا گھبرانے کے باوجود ہندوستان آنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ بھلا اتنی معمولی سی بات کیسے ٹال دیتا ـــــ !

اس لڑکے نے فش کو بتایا تھا کہ اس کا دنیا میں کوئی نہیں ہے وہ اکیلا ہے۔ ماں باپ تو تھے۔ لیکن بیٹے کو انگریزی تعلیم دلاتے دلاتے وہ اتنے قلاش ہو گئے کہ بھیک کا۔ کاسہ لے کر گھر سے جو نکلے تو پھر بمبئی کی پیچدار سڑکوں پر راستہ ہی بھول گئے۔ راستہ بھولنے کی عادت اس دیس میں عام ہے۔ انتہا یہ ہے کہ بیرونی ممالک کے باشندوں کو ان کے گھروں کے راستے اچھی طرح معلوم ہیں اور یہ خود فراموش اپنے آپ میں مست قوم سب کچھ لٹا کر رہزن کو دعا دینے والی قوم ـــــ ! ہاں تو اس لڑکے کے ماں باپ راستہ بھول گئے تھے مگر مرے نہیں تھے۔ راستہ بھول جانے کو کسی طرح بھی موت نہیں کہا جا سکتا۔ وہ ضرور زندہ تھے کیونکہ ہندوستان میں جگہ جگہ مسجدیں، مندر، دھرم شالے اور خیراتی سرائیں ہیں۔ یہاں کے بسنے والے لوگ دیس کی گرم آب و ہوا اور مسالوں کی حدت سے بہت گناہ آلود زندگی بسر کرتے ہیں۔ اپنے گناہوں کے دھونے کے لئے خیر خیرات بہت کرتے اسی لئے یہاں بھکاری بہت کم مرتے ہیں ـــــ

دھرم شالوں، خیرات خانوں، مسجدوں، مندروں کی سیڑھیوں پر بہت خیرات ملتی ہے اور جب تک خیرات ملتی ہے۔ ایک ہندوستانی کو کچھ نہیں چاہئے —— آزادی بھی نہیں چاہئے وہ صرف زندہ رہنا چاہتا ہے۔ اور جب تک اس کو بھیک ملتی رہتی ہے وہ مرتا بھی نہیں۔ اس لڑکے نے جس نے فش کو اپنا نام ماجد بتایا تھا۔ فش سے یہی کہا تھا کہ وہ کئی مرتبہ خودکشی کرنے کے ارادے سے سمندر میں چھلانگ مارنے کے قریب تھا کہ اسے کوئی نہ کوئی جہاز قریب آتا نظر آیا۔ اس جہاز سے کوئی انگریز یا امریکن سیاح اترا اور ماجد اس سیاح کو ہندوستان کی سیر کراتا خیرات پاتا رہا —— آج بھی وہ خودکشی کا منصوبہ باندھ کر ہی سمندر پہ آیا تھا۔ لیکن اتفاق سے فش اور ولف نے جان بچالی۔ اب ماجد کو یقین ہو گیا تھا کہ موت بھی کسی نہ کسی بورژوائی تہذیب کی پابند ہے جو ٹھیک وقت پر ہی آئے گی۔ نہ وقت سے پہلے اور نہ وقت کے بعد۔

شام کو فش، ولف اور ماجد تاج محل کے احاطے باہر نکلے۔ شام بڑی سفید اور چمکیلی تھی۔ سڑکوں پر ٹرامیں، موٹریں، بسیں دوڑ رہی تھیں۔ فٹ پاتھوں پر انسانوں کا سیلاب بہہ رہا تھا جن میں پارسی، گجراتی، کرسچین، مسلمان، بوہرہ مرہٹہ لڑکیاں جل پریوں کی طرح اس سیلاب میں بہہ رہی تھیں۔ قسم قسم کے لباس، قسم قسم کی بولیاں، قسم قسم کی صورتیں، قسم قسم کے رنگ ولف نے آوارہ نظروں سے اس سیلاب کو دیکھتے ہوئے کہا۔

عجیب ملک ہے یہاں کے لوگ ایسے عجیب عجیب

لباس کیوں پہنتے ہیں۔ یہاں کے لباس میں یونیفارمیٹی کیوں نہیں ہے ——"

ماجد ہنس پڑا —— عادتاً۔

"یونیفارمیٹی —— ! لفظ بہت اچھا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے کسی کرسچین چھوکری کا نام ہے —— مگر صاحب۔ یونیفارمیٹی کے معنی آزادی کے بھی ہیں۔ اور ہم آزادی نہیں چاہتے ہم —— ہندوستانی بڑے نمک حلال ہوتے ہیں نا!"

دلفند بولا ——

"بعض بعض اوقات تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں جانے کیا کیا بک دیتے ہو!"

ماجد نے جواب دیا۔

"میں یہ بتانا چاہتا تھا کہ ہماری قوم انفرادیت کی بڑی دلدادہ ہے۔ وہ اجتماعیت سے نفرت کرتی ہے۔ ہماری ڈیڑھ سو سال کی تاریخ کا یہی خلاصہ ہے۔ یہاں کا ہر انسان تنہا اپنے آپ کو ہندوستانی قوم سمجھتا ہے۔ اس وقت یا تھر پر آپ پاجاموں، دھوتیوں، پتلونوں شلواروں اور ساڑھیوں کو ایک ساتھ چلتا پھرتا دیکھ رہے ہیں۔ لیکن ایک پاجامہ ایک دھوتی سے اور ایک شلوار ایک ساڑھی سے کہتی ہے ....

دلف بات کاٹتے ہوئے، جیب میں سگریٹ کیس ٹٹولنے لگا۔

"تم میرا دماغ چاٹ جاتے ہو۔ اچھا اب بتاؤ کہاں چلیں۔ اچھے تفریحی مقامات، باغ، ناچ گھر، سینمائیں، ریستوران کی سیر کراؤ اب"

ماجد نے کہا۔

آرے صاحب۔ بمبئی جیسا حسین شہر تو آپ کے امریکہ میں بھی نہ ہوگا۔ چوپاٹی، مالا بارہل، پالو، مرین ڈرائیو، ماہم، وکٹوریہ گارڈن، شیواجی پارک، بھنڈی بازار۔۔۔۔"

فش زور سے ہنس پڑی۔

"بھنڈی بازار ـــــ واٹ آفل اے نیم۔ اچھا اب یہاں سے کہیں چلو۔۔۔۔۔۔ اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا ہے"

مگر اسی اثنا میں ان کو دس بارہ بھکاریوں کے ایک گروہ نے، جن میں بوڑھے، ادھیڑ، جوان، نوجوان، لڑکے بالے، عورتیں تھیں گھیر لیا۔ ان کے جسموں پر چیتھڑے تھے اور چیتھڑوں میں سے ہڈیاں خندہ زن ـــــ وہ بار بار ماتھے پر ہاتھ مار مار کر سلام کر رہے تھے۔ ماجد نے انھیں ڈانٹ کر کہا۔

"بھاگ جاؤ شیطانو بھاگ جاؤ"

فش نے خوفزدہ نظروں سے انھیں دیکھتے ہوئے پوچھا

"اوہ ——— یہ بھکاری!"

ماجد نے کہا۔

"ہاں مادام۔ یہ بھکاری! اسی طرح ہر نئے آنے والے کے آگے ہاتھ پھیلا دیتے ہیں۔"

فش نے اپنا پرس کھول کر ایک دس روپے کا نوٹ نکال کر ماجد کو دیا کہ اسے ان بھکاریوں میں تقسیم کر دو۔ ماجد نے اس کا نوٹ واپس کرتے ہوئے کہا۔

"مادام ——— اگر آپ اسی طرح یہاں پیسہ لٹاتی رہیں گی تو امریکہ کی ساری چاندی سونے کی کانیں خالی ہو جائیں تب بھی یہ کالی کلوٹی ہتھیلیاں آپ کے آگے پھیلی رہیں گی۔ یہ تو بھکاریوں کا ایک چھوٹا سا بھنور ہے۔ اگر آپ نے اس بھنور میں ایک پیسہ بھی پھینکا تو پھر یہ بھنور پھیلتا جائے گا ——— اور پھیل پھیل کر بنگال، ہمالیہ اور راس کماری کے ساحلوں تک وسیع ہو جائے گا۔ آپ کا اس میں سے نکلنا تک مشکل ہو جائے گا۔ اچھا اب چلئے۔"

فش نے چلتے چلتے کہا۔

"کوئی ٹیکسی لے لو۔ ہم امریکن پیدل چلنے کے مطلق عادی نہیں ہوتے۔"

ماجد نے کہا۔

"مادام آپ ہندوستان کی سیر کرنے آئی ہیں۔ ہندوستان کی سیر کرنی مقصود ہو تو یہاں پیدل ہی گھومیئے۔ یا یہاں کی ٹراموں، بسوں، لوکل گاڑیوں میں گھومیئے —— اصلی ہندوستان اتنا بڑا ہے کہ ٹیکسی کی چھوٹی چھوٹی کھڑکیوں سے نظر ہی نہیں آسکتا —— اچھا وہاں پرنس آف ویلز میوزیم کے پاس ٹریم کا اسٹیشن ہے۔ وہاں سے ٹریم کیچ کرلیں گے۔"

ولف نے پوچھا۔

"مگر آپ ہمیں کہاں لے جارہے ہو۔"

ماجد نے جواب دیا۔

"پہلے تو آپ میرے گھر چلیئے۔ ہندوستان میں سب سے پہلے آپ کو میرا گھر دیکھنا چاہیئے۔ مگر میرا گھر ہندوستان کا بہت مشہور مقام ہے۔ میرا گھر دیکھ لینے کے بعد آپ کو ہندوستان کے تقریباً چالیس کروڑ ہندوستانیوں کے گھر دیکھنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ ہندوستان کے چپے چپے پر آپ کو میرا گھر نظر آئے گا۔"

فش نے حیرت سے ماجد کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"تم بہت مکار ہو —— بڑے زہریلے۔ میں اب تمہیں کچھ کچھ سمجھنے لگی ہوں۔ اچھا چلو تمہارے ہی گھر چلیں۔"

ولف چڑ کر بولا۔

"ارے ہم تو مشہور مقامات کی سیر کے لئے آئے ہیں تاج محل دیکھنے ——"

ماجد فش کی قیافہ شناسی سے متاثر اور مسرور ہو کر اکڑ کے کہنے لگا۔

تاج محل —— ہونہہ۔ تاج محل اتنا نظر افروز نہیں جتنا کہ میرا گھر —— میں سچ کہہ رہا ہوں۔ تاج محل کی سی چمکیلی دیواریں، مرمریں گنبد، لمبے لمبے مینار تو آپ امریکہ میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن جو مقامات آپ کو دنیا کے کسی خطے پر نہیں دکھائی دیں گے۔ وہ میں آپ کو دکھاؤں گا۔"

ماجد بات ختم کر کے پھر مسکرانے لگا۔ اس کی مسکراہٹ فش کے ہونٹوں پر بھی پھیل گئی۔ اس نے شریر آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے معنی خیز انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو اپنے ہی گھر چلو —— ڈارلنگ ولف لٹ اس ہیکو ایں اڈونچر ——"

ماجد نے بڑے مہذب انداز میں سر جھکا کر شکریہ ادا کیا اور ٹکٹ لینے چلا گیا۔ ولف نے کہا۔

"ڈیر فش —— مجھے اس لڑکے پر کچھ کچھ شبہ ہونے لگا ہے یہ ہندوستانی بڑے جرائم پیشہ ہوتے ہیں۔"

فش —— وہ خطر پسند فش، ولف کے اس کمزور دل پر ہنس پڑی

اور ٹیڑھے لبوں سے پوچھا۔

"پستول رکھ لئے ہیں نا جیب میں ـــــــ؟"

ولف نے لبوں کا خم دیکھے اور سمجھے بغیر جواب دیا۔

"ہاں ہاں ـــــــ سات سات فائر والے دو پستول رکھ لئے ہیں۔"

فش کے لب ابھی خمیدہ ہی تھے۔ اس نے کہا۔

تو پھر ڈرتے کیوں ہو ـــــــ چودہ ہندوستانیوں کو ہلاک کردیں گے ـــــــ ڈارلنگ!"

اسی اثنا میں ٹریم آگئی۔ تینوں اس میں سوار ہو گئے۔ ٹریم گھڑگھڑانے لگی...... اونچی اونچی بلڈنگیں....... بڑی بڑی دوکانیں....... کلاک ٹاورس...... مجسمے...... باغیچے...... ہوٹلیں...... سینمائیں...... بار...... قحبہ خانے...... ٹریموے کے اسٹیشن۔

اور پھر ایک چھوٹے سے اسٹاپ پر ماجد نے انھیں اتار لیا۔ وہ پیدل چلنے لگے۔ قدم قدم پر ان کے آگے کالی کالی کلوٹی مرجھائی ہوئی ننھی منی چوڑی چکلی ہتھیلیاں پھیلتی گئیں۔ بھنور پھیلتا جا رہا تھا۔ پیسہ ـــــــ روٹی کا شور۔ جیسے بھنور میں بڑے تیز تیز چکر پیدا ہو گئے ہوں ـــــــ پیسہ ـــــــ روٹی ـــــــ!

ولف اور فش ایسا محسوس کر رہے تھے جیسے ساری دنیا سمٹ سمٹا کر تنگ اندھیری پیچدار گلیوں میں سہم کر چھپ گئی ہے۔ گندگی کوڑا کرکٹ، عفونت،

غلاظت سے بیتاب ہو کر ولف نے غصیلی آواز میں ماجد سے پوچھا۔

"ارے کہاں لے آئے ہو تم ——— !"

ماجد نے ولف کو جواب دینے اور فش کو مرعوب کرنے کی خاطر بڑے افسانوی انداز میں جواب دیا۔

"تاج محل کے پس منظر میں لے آیا ہوں"

پھر ایک اندھیری گلی میں ایک لکڑی کے چرچراتے ہوئے زینے پر چڑھتے ہوئے وہ انھیں اوپر لے گیا۔ چرچراتی لکڑی کا ایک بوسیدہ دروازہ کھول کر ماجد اندر گیا۔ اندر کی رکی ہوئی بند مسموم ہوا بھبھک کر باہر آئی۔ فش اور ولف دو دو قدم پیچھے ہٹ گئے۔ ماجد نے ماچس جلا کر ایک ٹوٹے کنارو اور بتی کی لو سے سیاہ حباب والا لیمپ جلایا۔ لیمپ کی گرنجی آنکھ نے بھڑک بھڑک کرتے، سات سمندر پار سے آئے ہوئے مہمانوں کا استقبال کیا۔ ماجد نے ایک جھولا جیسی چارپائی پر ایک چادر بچھا دی۔ ایک لکڑی کی تپائی پر سے شکسپیر ملٹن شیلے ایکٹس وغیرہ کی کتابیں نیچے زمین پر پھینک کر ولف کو تپائی پر بٹھا دیا اور فش چارپائی کے جھولے میں بیٹھ گئی ——— جھول گئی۔ اور ماجد کا مذاق اڑانے کی خاطر کہا۔

یہی ہے تاج محل سے زیادہ نظر افروز مکان! بھئی بہت اچھے ——— کیوں ڈیر ولف ہمارا نیویارک کا گھر اس کے مقابلے میں تو گھونسلا معلوم ہوتا ہے ——— !"

فش کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

ماجد نے خوش ہو کر کہا۔

"مادام ——— آپ کے جملے مجھے اتنے پسند نہیں جتنی آپ کی ہنسی ——— میرے مکان کی تعریف باہر سے آنیوالے کا ایک بیساختہ قہقہہ ہی ہے میں عرصے سے اسی قہقہے کو اپنے مکان میں گونجتا ہوا سننا چاہتا تھا۔"

اس کے بعد ماجد نے کہا۔

میں ذرا ابھی بازو کے مکان تک جا آتا ہوں۔ آپ دو منٹ کی مجھے اجازت دیں۔"

اجازت لینے سے پہلے ہی وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔ دلن کا ہاتھ بے اختیار جیب میں رکھے ہوئے سات فائروں والے پستول پر پڑا۔ مگر بازو کے گھر میں تو چائے کی پیالیوں کی کھڑکھڑ کرنے کی آواز آرہی تھی ماجد نے واپس آکر کہا۔

"مادام ——— عرصے سے میری تمنا تھی کہ اپنے اس کلبۂ تاریک میں کسی یورپی یا امریکی باشندے کو مہمان بناؤں۔ وہ ہندوستان دکھا سکوں جو میرے اس تنگ و تاریک گھر میں آپ لوگوں کی نگاہوں سے چھپا دیا گیا ہے۔ آپ کی طرح ہر روز بیسیوں سیاح یورپ و امریکہ سے ہندوستان آتے ہیں۔ لیکن انھیں سرکاری مہمان خانوں میں ٹھیرایا جاتا ہے بڑی بڑی شاہراہوں پر گھمایا جاتا ہے۔ تاج محل، اقطاب مینار

پُرانے راجاؤں اور بادشاہوں کے محلات، قلعے، نہریں، تالاب، مسجدیں، مندر، لاٹیں، کتبے، قبریں دکھائی جاتی ہیں۔
——— میں یہ نہیں کہتا کہ وہ چیزیں دیکھنے کی نہیں ہیں۔ لیکن وہ سب عمارتیں پرانے ہندوستان کی پُرانی فن کاری کے نمونے ہیں۔ لیکن جس دن ہندوستان کا بادشاہ رنگون کے قید خانے میں مر گیا۔ اسی دن پرانا ہندوستان بھی مر گیا اس کے بعد ایک نیا ہندوستان جنم لیتا ہے۔
نئے ہندوستان کا جنم اسی تنگ و تاریک بوسیدہ کوٹھڑی میں ہوا۔ اس بوسیدہ کوٹھڑی میں آپ نئے ہندوستان کی نئی تہذیب، نئی معاشرت، نئی ثقافت، نیا فن تعمیر، نیا آرٹ، نئی موسیقی، نیا رقص۔ یعنی ہندوستان کی نئی زندگی کے سارے خط و خال آپ کو نظر آئیں گے۔"
ماجد کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ فش غور سے اس کے چہرے کے بدلتے ہوئے رنگ دیکھ رہی تھی اور ولف جیب میں چھپے ہوئے سات فائر والے پستول پر انگلیاں پھیر رہا تھا۔ ماجد پھر لہجہ دھیما کرتے ہوئے کہا۔
"آپ نئی تہذیب کا نیا لباس دیکھنا چاہیں تو میں اپنا کوٹ اُتار دوں ——— دیکھئے میری قمیص پیچھے جگہ جگہ سے پھٹ گئی ہے۔ اسی کوٹ میں میں دامن کے چاک اور گریبان کے چاک کو چھپا لیتا ہوں۔ لیکن اب آپ سے نہیں چھپاؤں گا

ان چیتھڑوں میں آپ کو نئی تہذیب جھانکتی نظر آئے گی. کالی کلوٹی ہتھیلیوں کا بھنور تو آپ نے دیکھ ہی لیا۔ وہ نئے ہندوستان کی معاشیات ہے۔ ادھر دیوار کی طرف آپ وہ عورت کی تصویر دیکھ رہے ہیں۔ اس کا نام نرگس ہے فلم ایکٹرس۔ اس کے پیچھے میری بی۔ اے کی ڈگری چھپی ہے وہ نئے ہندوستان کی نئی تعلیم ہے۔ نئی زبان! میں نے اپنی ماں کے کانوں کے آویزے۔ ہاتھوں کے کڑے بیچ کر اور باپ کا چار بیگھہ والا کھیت رہن رکھ کر وہ ڈگری حاصل کی ہے۔

ماجد کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔ ولف اٹھ کھڑا ہوا۔ اور بولنے لگا۔

"اوہ ——— کیا گرمی ہے۔ یہ چھت کتنی نیچی ہے ہم امریکی اسکائی اسکریپرس کے رہنے والے! ہمارے یہاں کی قبریں ان مکانوں سے زیادہ ہوادار ہوتی ہیں۔ اب یہاں سے چلو ——— کہیں باہر کھلی فضا میں!"

ماجد نے کہا۔

اب یہاں سے اور کہاں جائیں گے جہاں جائیں گے وہاں ایسی ہی نیچی چھتیں، بوسیدہ دیواریں، لیمپ کی آتش رنگ روشنی، مٹی کے تیل کی بیستانہ تیز بو آپ کا پیچھا نہ چھوڑے گی

——— مادام ہندوستان عرصے سے کھلی فضا، خوشبوؤں اور اُجالے کے لئے ترس رہا ہے ———"

ولف بولا ———

"اچھا۔ اب چلو۔ بہت دکھ مار و چکے اپنے دیس کا ——— میں نے یقین نہیں کیا تھا۔ مگر اب یقین ہو گیا ہے کہ تم ہندوستانیوں کو رونے بلبلانے کی بڑی بری عادت ہے۔ فش بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ لیکن ماجد ان کی منتیں کرنے لگا۔

"آپ کچھ دیر اور ٹھہر جائیے۔ میرے گھر کی چائے پی لیجئے میں نے آپ کو اتنی زحمت دی ہے۔ چائے کے ساتھ ساتھ میں آپ کو نئے ہندوستان کا حُسن بھی دکھاؤں گا نئے ہندوستان کی نئی موسیقی اور نیا رقص بھی دکھاؤں گا۔ یہ آپ نہ دیکھیں گے تو آپ کا سفر غیر مکمل رہ جائے گا تاج محل دیکھنے سے پہلے آپ کا یہ دیکھنا نہایت ضروری ہے۔ یہ تاج محل کا پس منظر ہے"

کچھ دیر کمرے کی فضا میں خاموشی طاری رہی۔ چھت کی کڑیوں میں چوہے کھڑبڑ ا رہے تھے۔ دور سے کہیں ایک بھوکی بلی کی میاؤں میاؤں ——— تیز ما آتی سنائی دے رہی تھی۔ جیسے وہ کسی آوارہ مزاج بلے کو چیلنج دے رہی ہو پھر یکایک کمرے سنسان میں چھن ——— چھن ——— چھن کی ہلکی ہلکی آوازیں بجنے لگیں۔ ماجد چونک کر دروازے سے

ہٹ آیا۔ اپنے کان کو آواز کی طرف متعین کرتے ہوئے بولنے لگا۔
"سنئے —— سنئیے یہ چھن چھن کی مدبھری آواز! یہی ہے ہندوستان کی نئی موسیقی۔ محبت کی ماری ایک دیوانی لڑکی دنیا کی نظروں سے چھپ چھپ کر اندھیرے کے سیاہ آنچلوں کے سائے میں دبے دبے قدموں چائے کی کشتی سنبھالے اپنے مفلس عاشق کے مہمانوں کی تواضع کرنے آرہی ہے ——
چھن چھن چھن چھن چھن ..... چلی آرہی ہے —— جب ہندوستان کا بادشاہ زندہ تھا۔ یہاں کی عورت بے باک انداز میں ناچتی تھی۔ آس پاس کوئی خطرہ ہی نہ تھا۔ عورتوں کے باپ کافی پیسے والے ہوتے تھے۔ آج لڑکی جوان ہوتی کل کسی گبرو سے اس کی شادی دھوم دھام سے کر دیتے۔ لیکن اب گھنگروں اور پازیبوں کا گلا رندھ گیا ہے۔ اس لئے کہ لڑکی کا باپ بھکاری ہے۔ وہ سات سال سے جوان ہے خوب پکی ہوئی جوانی ہے۔ وہ جوانی کو لاکھ سنبھالنے کی کوشش کرتی ہے۔ لیکن کمرے کی چھت بہت نیچی ہے۔ لالٹین کی مدھم روشنی اس کی زندگی کا اندھیرا دور نہیں کر سکتی۔ اس اندھیرے میں جیسے وہ اندھی ہو جاتی ہے۔ اپنی جوانی کا بوجھ وہ بانٹ دینا چاہتی ہے۔ کون دیکھتا ہے اندھیرے میں! اسی لئے

وہ اندھیرے میں دبے دبے پاؤں بھٹکتی پھرتی ہے ....
جس دن ہندوستان کا بادشاہ مر گیا۔ اس دن کے بعد سے
اندھیرے میں نوجوان کنواریاں یوں ہی بھٹکتی پھر رہی ہیں
——— عورت اب ناچتی نہیں صرف بھٹکتی پھرتی ہے۔ آگے
میں ہندوستانی عورت کا ناچ بھی دکھاؤں گا۔ لیکن جو موسیقی
اس کی ہلکی ہلکی دبی دبی چھن چھن چھن چھن میں ہے وہ بیباک
طور پر قہقہے لگانے والے گھنگروؤں میں نہیں ——— سنئیے
نئی موسیقی کی تانیں بہت قریب آ رہی ہیں ——— چائے
آ رہی ہے ——— میری محبوبہ آ رہی ہے ——— آ گئی
میری ....

ایک لمبی دبلی پتلی سانولی لڑکی، بڑی بڑی پلکوں، بسورتی صورت والی
لڑکی چائے کی کشتی سنبھالے اندر آتی ہے۔ دلت اور فش کو دیکھ کر کچھ ٹھٹک کر
رک جاتی ہے۔ لیکن ماجد دوڑ کر اسے پکڑ لیتا ہے اور اس کے شانے پر ہاتھ
رکھ کر اندر لے آتا ہے۔ اور بولتا ہے۔

"تتلی پیاری ——— تو ان سے شرماتی ہے۔ یہ تو بیرونی
سیاح ہیں۔ سات سمندر پار سے تجھے دیکھنے آئے ہیں ———
تو بھی تو تاج محل ہے نا! یہ کشتی مجھے دیدے ——— وہاں
کونے میں ٹرنک پر بیٹھ جا۔ شرم آتی ہے تو ضرور شرما۔ مگر آنچل
ہٹا دے چہرے سے ——— تاکہ شرم سے تو

پسینہ پسینہ ہو جائے ——— !"

ماجد فش کی طرف مڑتے ہوئے بولا۔

"مادام ——— یہاں کی عورت میں عورت ہونے کا شدید احساس ہوتا ہے۔ وہ مرد سے آنکھ ہی نہیں ملا سکتی۔ اس لڑکی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے کی ایک حسرت عرصے سے میرے دل میں ہے"

لڑکی بڑی متناسب الاعضا تھی۔ اس کی آنکھیں جیسے نرگس کے پھولوں کے کٹورے تھے۔ اور ان آنکھوں میں ہندوستان کی ازل سے شکست کھائی ہوئی غلام نسائیت کا حزن جھلک رہا تھا۔ یہ حزن بھی حُسن ہے۔ ایک آقا کی نظروں کے لئے سب سے بڑا حُسن غلامی ہے ——— وہی محمود و ایاز والی پرانی کہانی ———

ماجد پھر بولنے لگا۔

میں آپ کو ہندوستان کا یہی حزن ——— یعنی حسن دکھانا چاہتا تھا۔ تاج محل پر بھی آپ ایسا ہی حزن و ملال دیکھیں گے یہاں مسرت سے چمکتی ہوئی آنکھوں کی کوئی تعریف نہیں کرتا یہاں آنسوں بہانے والی آنکھیں بہت پسند کی جاتی ہیں۔ یہاں کی عورت کی آنکھوں سے جو آنسو بہہ نکلتا ہے۔ وہ صدف سے نکلے ہوئے موتی سے زیادہ قیمتی اور حسین ہوتا ہے۔ آپ اس لڑکی کی چوٹی دیکھئے ——— کتنی لمبی ہے۔ مادام! دنیا کی

ہر عورت نے اپنی چوٹی کٹوا کر آزادی حاصل کر لی ہے لیکن ہندوستان میں شب ہجر اور گیسو کا طول متوازی ہے دراصل یہاں عورت کے لئے چوٹی نہایت ضروری ہے۔ اس کو گھر سے باہر دھکیلنے میں بڑی دقت پیش آتی ہے۔ اس کا جسم سمٹ سمٹ کر گولا ہو جاتا ہے صرف چوٹی ہی ہاتھ میں آتی ہے جسے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے دروازے کے باہر بازار میں ڈھکیلا جا سکتا ہے۔ پھر چاندی کے سکوں کے عوض یہ چوٹی دوسرے کے ہاتھ بیچ دیتا ہے۔ دوسرا مرد جب تک زندہ اور اس کا پیٹ بھرنے کے قابل ہوتا ہے۔ اس کی نظریں چوٹی کی طرف نہیں اٹھتیں لیکن جس دن چولھے کی سرد راکھ میں کوئی بلی سو جائے۔ اس دن وہ اس عورت کی چوٹی پکڑ کر فارس روڈ، گرگام، گول پیٹھ، سفید گلی، کناری بازار، ٹبی بازار، چاوڑی، سوناگاچی، محبوب کی مہندی، چوک، ہیرا منڈی کے کوٹھوں کی سیڑھیوں پر گھسیٹتا ہے۔ پھر وہاں کئی کئی مرد اس کی چوٹی پکڑتے ہیں۔ درد کی شدت سے بیتاب ہو کر وہ رونے لگتی ہے۔ لوگ جھوم جھوم کر واہ واہ کرتے ہیں کہ کیا اچھا گا رہی ہے ——— کیا اچھا ناچتی ہے ———!

× × × × × ×

× × × × × ×

اچھا اب آئیے یہاں سے چلیں۔ مگر پہلے آپ اس لڑکی کی صورت غور سے دیکھ لیجئے۔ آپ ہندوستان میں جہاں جائیں گے یہ لڑکی ------ یہ عورت آپ کو نظر آئیں گی۔ اس کے پائوں کی چھن چھن ------ چھن چھن آپ سنائی دے گی۔ اس کی لمبی چوٹی مردوں کے ہاتھوں میں پھنسی ہوئی نظر آئے گی۔ ولف اور رشی دیوانوں کی طرح اس لڑکی کے جھکے ہوئے سر جھکی ہوئی پلکوں کو دیکھتے ہوئے باہر نکل آئے۔

× × × × × ×

× × × × × ×

× × × × × ×

اندھیرا ------ بیدار گلیاں ------ ایک شاہ راہ! ماجد نے کہا دیکھئے یہ فارس روڈ ہے۔ یہ سڑک دن کے اجالے میں جیسے اونگھتی نظر آتی ہے لیکن جب آسمان کے مشرقی کناروں سے اندھیرے کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا آتا ہے۔ اور ساری کائنات اندھیرے میں غرق ہو جاتی ہے تو فارس روڈ انگڑائیاں توڑ توڑ کر اپنی غنودگی دور کرتی ہے۔ ناچنے گانے لگتی ہے۔ روشنی سے جگمگانے مسکرانے لگی ہے۔

وہ سامنے دیکھئے ------ بجلی کے کھمبے کے پاس ایک بھکارن کھڑی گا رہی ہے۔ اس کے کپڑے چیتھڑے ہو رہے ہیں۔ لیکن اس کی آواز میٹھی ہے۔

”کسی کی خاک میں ملتی جوانی دیکھتے جاؤ“

کتنی رسیلی آواز ہے ——— اور اصل کپڑوں کے چیتھڑوں کا آواز سے کوئی تعلق ہی نہیں ہوتا۔ بعض عورتیں بڑی چمکیلی ساڑھیاں پہنتی ہیں۔ لیکن ان کی آواز سن کر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے گلے میں ٹین بج رہا ہے ———

کسی کی خاک میں ملتی جوانی . . . . .

آپ شاید یہ سوچ رہے ہوں کہ اسے اپنی خاک میں ملتی جوانی کا احساس ہے ——— نہیں مطلق احساس نہیں! ——— یہ گانا تو اسے ایک استاد نے سکھایا تھا۔ جب وہ بالکل نئی نئی جوان ہوئی تھی۔

ہندوستان میں جوان عورتوں کی کمی نہیں۔ دراصل یہاں گرمی بہت ہوتی ہے۔ اس لئے تاریخی روایت کے مدِ نظر پانچ پانچ پانڈو ایک دروپدی کو اپنی باہوں میں بھینچ لیتے ہیں، اپنے سینے سے لگا لیتے ہیں ——— کچھ عرصہ پہلے یہ بھکارن اسی فارس روڈ کی اس اونچی جالی میں رہتی تھی لیکن پانڈوؤں نے اس کو اس بری طرح اپنی باہوں میں بھینچا۔ سینے سے چمٹا لیا کہ وہ زخمی ہو گئی ——— اب وہ ایک ٹوٹا ہوا کھلونا ہے۔ ٹوٹا ہوا کھلونا ——— اب اسے سڑک پر اس بجلی کے کھمبے کے پاس پھینک دیا گیا ہے۔ پانچ برس پہلے میں نے اس کی جالی میں اس کو پانچ روپے دئے تھے ——— آج اس کو صرف ایک پیسہ دیتا ہوں۔

آپ میرے پیچھے ہی پیچھے چلے آئیے۔ وہ سامنے پتلون اور قمیص میں ملبوس ایک آدمی ہمارا ہی انتظار کر رہا ہے میں اس بات کرتا ہوں۔

"کیوں بے فرزو ——— !کسی کی جوانی خاک میں ملا دینے کا

کوئی انتظام کیا ہے آج ——— !"
آدمی نے بتیسی چمکاتے ہوئے کہا۔

واہ ——— کیا بات پوچھی ہے آپ نے! ذرا اوپر
چلئے پھر میری پیٹھ ٹھونکنا ——— !
ماجد نے کہا۔
لیکن وہاں کوئی نہ ہو ——— امریکہ کے ایک بہت بڑے
بینکر اور اُن کی لیڈی گانا سننے آئے ہیں۔ جا جلد انتظام
کر آ ———"
پانچ دس منٹ بعد وہ اوپر گئے۔ ایک سولہ سترہ برس کی عورت
پیلا پیلا چہرہ، بے ڈھنگے طور پر پھولتا ہوا جسم، ڈھلی ہوئی ساڑھی، گالوں
پر پاؤڈر ——— ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی ہوئی نہیں بلکہ لائی ہوئی ———
گدّے پر بیٹھنے بعد ماجد نے فش سے پوچھا۔
"مادام! آپ اس عورت کو پہچانتی ہیں؟"
فش نے کہا ———
"نہیں تو ——— ؟"
ماجد نے کہا۔
"یہ تو وہی عورت ہے جسے آپ نے میرے کمرے میں دیکھا
یہ وہی عورت ہے جو باہر بجلی کے کھمبے کے پاس کھڑی بھیک
مانگ رہی ہے گر اُس کا نام بنفشہ جان ہے اور

بجلی کے کھمبے کے پاس بھیک مانگتی ہوئی بھکارن کا نام
چمبیلی جان ہے ——— مگر ہیں سب کے سب پھول!

× × × × × ×

× × × × × ×

ہاں بنفشہ جان! ان سات سمندر پار سے آئے ہوئے معزز
مہمانوں سے اپنے دیس کو لوٹنے سے پہلے استدعا کرو کہ
کسی کی خاک میں ملتی جوانی دیکھتے جاؤ"
مگر ولفٹ اُٹھ کھڑا ہوا ——— اس کا چہرہ تیوریوں سے غصیلا نظر
آرہا تھا۔ اس نے ماجد سے کہنے کے بجائے فش سے کہا۔
"چلو یہاں سے ——— میں ایسی گندی جگہ ایک لمحہ کے لئے
نہیں ٹھہر سکتا"

× × × × × ×

× × × × × ×

بنفشہ جان کی جوانی کے خاک میں ملنے والے نظارے سے محفوظ
ہوئے بغیر ولفٹ، فش اور ماجد اس ہندوستان سے باہر نکل آئے۔ جو
ایک طوائف کا گھر ہے۔ اور اس ہندوستان میں داخل ہوئے جو ایک اندھیری
گلی ہے فٹ پاتھوں پر جگہ جگہ تار تار کپڑوں میں ٹھٹھرتے ہوئے مرد عورتیں لڑکے
بالے پیسہ مانگنا اور گالیاں کھانا بھول کر ٹانگیں پھیلائے سو رہے تھے۔ فش نے پوچھا
"یہ لوگ اپنے گھروں میں کیوں نہیں سوتے ———؟"

ماجد نے چونک کر پوچھا۔

مگر ——— !

اور پھر جلد ہی کہنے لگا۔

"یہ لوگ دراصل بڑے بڑے محلوں میں رہتے ہیں۔ ان کے کھانے پینے اور روپوں پیسوں کا سارا انتظام بڑی بڑی بلڈنگوں میں ہوتا ہے۔ جب انھیں بھوک لگتی ہے۔ یا پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ ہر بڑی بلڈنگ کی پھاٹک پر پہنچ جاتے ہیں۔ اور یہاں آکر سو جاتے ہیں۔ کیونکہ محلوں اور بڑی بڑی بلڈنگوں میں تازہ پاک صاف اور ٹھنڈی ہوا ——— بہت کم آتی ہے اونچی اونچی دیواروں سے ٹکرا کے رہ جاتی ہے۔ یہ نواب زادے! یہ پرانے ہندوستان کے شہزادے ——— ! یہ گرمی اور گھٹن کی مطلق تاب نہیں لاتے ہیں۔"

فش نے زمین پر لوٹتے ہوئے ایک مونڈھے کے ٹھکنے سے ٹھوکر کھا کر سنبھلتے ہوئے کہا۔

"تم باتیں تو خوب بنا لیتے ہو۔"

ماجد نے جواب دیا۔

"ہاں مادام ——— باتیں بنانے کے فن میں تو میں نے کمال حاصل کیا ہے۔ کاش کوئی یونیورسٹی محض باتونی انسانوں کے لئے کھولی جائے۔ مجھے اپنے آپ پر اعتماد ہے کہ میں اس یونیورسٹی میں

میرٹ سے پاس ہو جاؤں ——— !"
ولف نے کہا ——— !
"اچھا ——— اب ایک ٹکسی لے لو۔ تمہاری بکواس سے
ناک میں دم آگیا ہے ——— یہ اندھیرا ——— اف ہم اُکتا گئے"
ماجد نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔
"ہاں آپ امریکی اندھیرے سے شدید قسم کی نفرت کرتے ہیں
ہائے اندھیرا ——— ! تیرا حُسن یہ نیلی آنکھیں کیا دیکھیں
ان کی تو راتیں بھی ان کی عورتوں کی آفتابی کرنوں سے منور ہیں"
"——— اے ——— او ماسٹر !"
ایرانی ہوٹل کی سیڑھیوں کے پاس ایک ٹکسی کار کھڑی تھی۔ شوفر
چائے کی خالی پیالی کو انگلی میں لٹکائے ہوئے اسٹیرنگ پر منہ اوندھائے اونگھ رہا تھا۔
ماجد نے اسے جگایا" ——— اے ——— او ماسٹر !"
اور پھر موٹر کی روشنی اندھیرے کا جگر چیرتی تاج محل ہوٹل پہنچی۔ فش نے
ماجد سے دوسرے دن سویرے آنے کا وعدہ لے کر دس دس کے پانچ نوٹ
دیئے۔ ماجد نے بالکل موروثی انداز میں جھک جھک کر دونوں کو سلام کیا۔ اور
پھر ایک فحش گیت اندھیری ہے یہ رات سجن۔ . . . گنگناتا ہوا
گلی کے ایک چھپے ہوئے نکڑ میں غائب ہو گیا۔

× × × × × ×

× × × × × ×

دوسرے دن ماجد سویرے ہی تاج محل ہوٹل پہنچ گیا۔ ولف سگار پیتا ہوا غلیظ طباعت شدہ ہندوستانی انگریزی اخبار پڑھ رہا تھا لیکن فش ابھی منہ اوندھائے نیند میں بھی تکیئے پر کاڑھے ہوئے گلاب کے پھول کو چوم رہی تھی —— ایک پھول دوسرے پھول کو چوم رہا تھا —— بڑا لذت آگین منظر تھا۔ ماجد نے اپنے جسم میں معاً ایک جنسی جھرجھری سی محسوس کی لیکن ولف کے تلخ لہجے نے سارا مزہ کرکرا کر دیا۔

"کل رات کہاں کہاں کی خاک چھانی ہے ہم نے؛ بیچاری فش تو رات بھر ڈراؤنے خوابوں سے گھبرا گھبرا کر جاگ اٹھی ہے۔ اب کہیں سویرے سویرے اس کی آنکھ لگی ہے۔"

ماجد نے الزام کو اپنے سر سے جھٹک دینے کے لئے جواب دیا۔

"صاحب —— ہندوستان کی راتیں جتنی اندھیری ہوتی ہیں۔ ان راتوں میں گھلے ہوئے خواب بھی اتنے ہی ڈراؤنے ہوتے ہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ بلکہ ہمارے دیس کے لوگ تو دن کے اجالے میں بھی ڈراؤنے گھناؤنے خواب دیکھتے ہیں۔"

ولف نے کوئی جواب نہ دیا۔ البتہ فش کسمسا کر جاگ پڑی۔ اپنی بڑی بڑی آنکھیں کھول کر ماجد کی طرف دیکھا تو ان آنکھوں کی جھلکتی گلابی کو دیکھ کر دل ہی دل میں اس نے مرزا سودا کو آواز دی کہ —— ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں۔ کل تک ماجد نے فش کو ایسی نظروں سے دیکھا ہی نہ تھا جن

نظروں سے وہ آج اس کو دیکھنے کے بجائے گھورنے لگا تھا ——— ایک پھولدار سلیپنگ۔ گاؤن میں اس کی صندلی پنڈلیاں! وہ صندلی پنڈلیاں جو ناچ گھروں میں گھنٹوں کی اچھل کود کے بعد سڈول بنائی گئی تھیں۔ ویسٹ بلیٹ سے کس کس کر پتلی بنائی کمر ——— ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فش کی تخلیق میں خدا سے زیادہ فش کا اپنا حصّہ ہے۔ خدا نے تو ہڈیوں پر گوشت منڈھ کر ایک لوتھڑا سا تخلیق کیا تھا۔ لیکن فش نے اس لوتھڑے کو سانچوں میں ڈھال ڈھال کر اپنے آپ کو کیا سے کیا بنا لیا۔

اس عرصے میں فش نہا کر دھو کر نیا چمکیلا فراک پہن کر باتھ روم سے باہر آئی۔ یہ بدلتے ہوئے جلوے دیکھ دیکھ کر ماجد کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ فش صرف امریکہ سے ہندوستان نہیں آئی ہے بلکہ اس کی اپنی زندگی میں بھی بہت دور تک گھس آئی ہے۔ شاید کبھی سلیمی سے بھی آگے نکل جائے ———!

ناشتے کے بعد بید کی آرام کرسی پر بیٹھ کر سگریٹ پیتے ہوئے وہ اپنی سیر کا پروگرام بنانے لگی۔

ولف بولا۔

"بمبئی سے اب میں بہت اکتا گیا ہوں۔ اب آگرہ چلو تاج محل دیکھ کر نیویارک لوٹ جائیں گے۔"

فش بولی۔

"نہیں ڈارلنگ ——— پہلے دہلی دیکھیں گے۔ سُنا ہے کہ وہاں ایک ایسا مینار ہے جو ہمارے اسکائی اسکریپروں سے بھی بلند ہے!"

ماجد نے بیچ میں ٹپکتے ہوئے کہا۔

"ہاں مادام ——— بہت بلند ہے وہ مینار! اس مینار کا ہندوستان پر بہت احسان ہے۔ ورنہ ہندوستان کو آسمان کبھی کا نگل گیا ہوتا"؟

ولف نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

"کیا اوٹ پٹانگ بک دیتے ہو۔ آسمان نگل گیا ہوتا!"

ماجد نے جواب دیا۔

"میں اوٹ پٹانگ نہیں بک رہا ہوں۔ میری دادی اوٹ پٹانگ بکتی تھی۔ اس نے مجھے بچپنے میں ایک کہانی سنائی تھی کہ جب فرنگی نے اودھ کی بیگمات کی کلائیوں سے چوڑیاں، کانوں سے بندے، گلے سے سونے چاندی، یاقوت و نیلم کے ہار چھینے تھے۔ تو اس وقت وہ بیگمات چیخ چیخ کر بد دعائیں دے رہی تھیں کہ الٰہی آسمان ٹوٹ پڑے! "الٰہی" ہندوستانی عورت کی بات بہت سنتا ہے۔ چنانچہ آسمان ٹوٹ پڑا لیکن اسی قطب مینار نے آسمان کو سہار لیا ——— آپ اس مینار کو نیچے سے دیکھئے تو آپ کو فوراً معلوم ہو جائے گا کہ آسمان اس مینار پر ٹکا ہوا ہے"!

ولف اور فش ——— اور پھر ماجد بھی ہنس پڑا۔

فش نے کاغذ پر اپنی سیر کا پروگرام لکھتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔

"دہلی ——— !"

ماجد نے کہا۔

مادام ——— میری ایک تجویز ہے۔ اگر آپ اس سے اتفاق کریں ——— دہلی جانے سے پہلے ہندوستان کا کوئی ایک دیہات دیکھ لیجیئے۔ منظر سے پہلے پس منظر دیکھ لینا بہت ضروری ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ کا سفر نامکمل رہ جائے اس نوجوان لڑکی کی طرح جس کے ہونٹ بوسے کی لذت آمیز لمس سے ناآشنا ہیں!

× × × × × ×

× × × × × ×

× × × × × ×

شام کی سہانی سفیدی، بھیگی بھیگی ہوائیں، ہرے ہرے کھیت اونچی نیچی ناہموار کچی سڑک پر ڈولتی اچھلتی موٹر۔ ... فنش تو موٹر کے دھچکے کھا کر ولف کی آغوش میں بار بار گر پڑتی ——— پھر شرما کر سُرخ ہو جاتی۔ وہ شاید اس لئے شرما رہی تھی کہ اب تک وہ صرف تنگ آغوش میں سمانے کی عادی تھی لیکن اب فطرت کے اتنے کھلے اتنے وسیع آغوش میں اسے ایسا عجیب عجیب محسوس ہو رہا تھا جیسے اتنے وسیع آغوش میں اس کی ذات اس کی ہستی حقیر ہوتی جا رہی ہے۔ اپنی ذات کو اسی نسائی احساس برتری سے پھر سے گرانقدر بنانے کے لئے وہ ولف کے آغوش میں گر گر پڑتی ۔ ماجد اگلی سیٹ پر

شوفر کے بازو بیٹھا فش کی اس نئی مسرت کو مڑ مڑ کر دیکھ رہا تھا بیچاری نے امریکہ میں ایسے ہرے ہرے کھیت، ایسے پھیلے پھیلے میدان ایسا نیلا نیلا آسمان، ایسی کھلی کھلی فضا کہاں دیکھی تھی، امریکہ تو بس بلڈنگوں کا ملک ہے پکی سڑکوں کا ملک ہے —— لیکن یہ کھیتوں کا ملک۔ یہ کچی سڑکیں —— ارے عورت کے ساتھ موٹر کی سیر کے لئے ایسی ہی اونچی نیچی ناہموار کچی سڑک چاہیئے۔

فش نے ولف سے کہا۔

"آہا —— کتنی وسیع زمین ہے یہ دنیا! یہ کھیت، یہ پہاڑیاں یہ ندیاں، یہ تالاب —— ڈارلنگ ہم تو ایسے مناظر صرف تصویروں میں دیکھتے ہیں۔ کتنے خوش نصیب یہاں کے لوگ!

ولف کی تائید یا امریکی برتری کو آواز دینے سے پہلے ماجد بول اُٹھا۔

ہاں مادام —— بہت خوش نصیب ہیں یہاں کے لوگ دھرتی کے کتنے بڑے میدانوں کا مالک ہے۔ یہ سامنے نیم کا جو بہت بڑا پیڑ نظر آرہا ہے۔ وہاں نبی کسان کا کھیت ہے۔ اٹھارہ بیگھہ زمین ہے اس کی۔ لیکن گاؤں میں صرف چھ گز لمبی اور چار گز چوڑی جھونپڑی۔ مگر ہے وہ خوش نصیب —— !

فش نے اس بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ اسی ترنگ میں کہنے لگی۔ کتنی پاک وصاف ہوا ہے۔ بھلا بتاؤ تو اس میں آکسیجن کی کتنی مقدار ہے"

ماجد نے کہا ــــــ

بہت کم آکسیجن ہے یعنی میرا مطلب یہ ہے کہ یہاں کے رہنے والوں کے لئے ناکافی ہے۔ اسی لئے یہاں کے لوگ چالیس سال سے پہلے ہی مر جاتے ہیں۔

فنش نے پوری آنکھیں پھیلا کر ماجد کو ایک لمحہ کے لئے دیکھا۔ اور اس کے ہونٹ بہت آہستہ آہستہ کھلتے مسکرانے لگے جیسے وہ ہندوستانیوں کے موت کے تاریخی اسباب وعلل بھی جان گئی ہے۔

اسی اثنا میں گاؤں قریب آگیا۔ سینکڑوں خار و خس کے جھونپڑوں کے آگے ایک اجلی دیواروں والی اونچی عمارت دکھائی دینے لگے۔ ماجد نے کہا۔

مادام۔ وہ ہے ڈاک بنگلہ ــــــ آپ گھبرائیں نہیں۔ وہ گاؤں سے کافی دور ہے۔ گاؤں کی نجاست گندگی دھواں بدبو سب سے دور ــــــ خاص صاحب لوگوں کے لئے بنایا گیا ہے۔ نئے ہندوستان کے فن تعمیر کاری میں ڈاک بنگلے کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ یہ ڈاک بنگلے نہ ہوتے تو شاید آپ جیسے بلڈنگوں والے ملک کے باشندے ہندوستان میں ایک لمحہ نہ جی سکتے۔

فنش نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کتنے باتونی ہو تم ــــــ!"

ولف نے تصحیح کی۔

"باتونی نہیں۔ بکواسی کہو بکواسی!"

ماجد مسکرا دیا۔

ڈاک بنگلہ ایک ندی کے کنارے واقع تھا۔ بیرہ سرخ چمڑی سنہرے بالوں، نیلی آنکھوں کو دیکھ کر دوڑا دوڑا آیا۔ پھاٹک کھولا۔ کمروں میں لمپ جلائے۔ جن کی مدھم روشنیوں سے گھبرا کر فنش نے کہا۔

"اوہ ـــــ اس اندھیرے میں نیند کیسے آئے گی"

ماجد نے تسلی دی۔

"اوہ ام ـــــ گھبرائیے نہیں وہ کھڑکی میں سے دیکھئے پیپل کے درختوں کی پھنگنوں سے چاند ابھر رہا ہے۔ ابھی کے ابھی چاندنی ہی چاندنی پھیل جائے گی ـــــ آئیے باہر برآمدے میں بیٹھیں"

فنش نے اسی

"ہاں ہاں ـــــ باہر ہی چلو"

لیکن دلعت نے سفر کی تکان، گرد و غبار سے اٹے ہوئے پسینے سے بھیگے ہوئے جسم کو باتھ روم کے ٹب کے حوالے کر دیا۔

فنش اور ماجد باہر نکل آئے۔ چاندنی خوب نکھر آئی تھی منظر بہت رومانوی ہو گیا تھا۔ دور کہیں سے چرواہے کی بنسری کی مدھم آواز چاندنی کی کرنوں سے کھیلتی آ رہی تھی۔

بڑی دیر تک سناٹا طاری رہا۔ صرف چاندنی کی کرنیں اور بنسری کی آواز۔

فطرت کا اتنا وسیع سیمیں آغوش ——— چاند اور فش . . . . چاند اور عورت . . . . مدوجزر ——— اتار چڑھاؤ۔ جانے کس عالم خود فراموشی میں فش نے ماجد کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اور جانے کونسی امنڈتی ہوئی لہر کی طاقت سے اس کا کندھا مسلنا شروع کر دیا۔ ماجد کچھ دیر پہلے چاند کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سلمیٰ کے آغوش میں پہنچ گیا تھا سلمیٰ کے آغوش سے چھوٹ کر بھاگا ——— چاند کی کرنوں کے ساتھ لڑھکتا زمین پر آگرا ——— اور فش اس کا کندھا مسل رہی تھی۔ وہ فش، جو امریکہ کے بہت بڑے بینکر کی بیوی تھی جسم سے نکل کر جانے کہاں چلی گئی تھی۔ صرف عورت کا جسم ٹھہرا تھا۔ چاندنی میں نہاتا ہوا عورت کا جسم، جو چاند کی کرنوں اور بانسری کی تانوں کے لمس سے کپکپا رہا تھا ——— مد ——— جزر ——— چڑھاؤ ——— لہریں بڑی زور سے ماجد کے سینے، باہوں، ہونٹوں سے ٹکرائیں۔ ایک خواب۔ اور نشیلی آواز گنگنائی۔

"ماجد ——— آئی لو یو۔ میرا جسم آگ سے پھنک رہا ہے ——— آگ!"

لہریں ماجد کے سینے، باہوں اور ہونٹوں سے پھر ٹکرائیں۔ اندر سے ولف کے کھنکھارنے اور سگار سلگانے کی آواز آئی ——— اتار ——— جزر ایک سخت پتھریلی چٹان سے ٹکرا کر لہریں شاد کام لوٹ گئی تھیں۔ ماجد کے ہونٹوں پر نمی چمک رہی تھی ——— جھاگ!!

ولف باہر آیا۔ اور فش کو اپنی بغل میں دبا کر وسیع چبوترے پر ٹہلنے لگا اور ماجد اندر کمرے میں چلا گیا۔ اس کے سارے جسم میں ننھے ننھے سے کیڑے

کلبلانے لگے تھے۔ وہ بستر پر گر پڑا۔ سر میں ہلکا ہلکا درد ——— کچھ سوچتے سوچتے وہ بڑبڑانے لگا ——— اے خدا۔ ان اجنبی ہاتھوں کا لمس میرے دل میں چھپی ہوئی، نازک، کومل، سندر سلیمی کو کوئی گزند نہ پہنچائے۔ وہ بہت نازک ہے۔ ان لمبے لمبے رنگ دار ناخنوں کے کچوکوں سے۔ مر جائے گی۔ ہئیں ـــ نہیں ——— اے خدا مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے ——— اے خدا!!

بڑی دیر تک وہ آنکھیں پھاڑے اندھیرے کو دیکھتا رہا۔ اور جانے کب کس کروٹ کے بل وہ نیند کے کھڈ میں گر گیا۔

دوسرے دن فش اور ولف سویرے ہی جاگ اُٹھے۔ لیکن ماجد ایسا بے خبر چارپائی پر پڑا سو رہا تھا کہ دھوپ کھڑکی سے کود کر اس کے چہرے پر جھک گئی تھی۔ لیکن وہ سوتا ہی پڑا رہا۔ فش اور ولف گاؤں کی ندی تک ٹہل آئے۔ مگر وہ سوتا ہی رہا۔ فش نے اس کی نبض دیکھی۔ اس کو سخت بخار ہو گیا تھا۔

ماجد ولف اور فش کو ہندوستان کے دیہات کی خاص طور پر سیر کرانا چاہتا تھا لیکن تیز بخار کی وجہ سے فش نے اس کو بمبئی لیجانا ہی مناسب سمجھا اور دوپہر شروع ہونے سے پہلے موٹر پھر بمبئی کی طرف لپک رہی تھی ——— کائنات کے تنگ آغوش کی طرف۔

× × × × × ×

دو سرے تیسرے دن ماجد کا بخار اُتر گیا ——— فش کا بخار بھی

اتر گیا تھا۔ اب ماجد فش سے آنکھیں ملا کر بات کرنے سے گھبراتا تھا۔ فش نے ساری ساری رات جاگ کر ماجد کی تیمار داری کی۔ لیکن ماجد دیواروں سے آنکھیں نہ ہٹاتا تھا۔

× × × × × ×

تندرست ہونے کے تیسرے دن پھر بمبئی کی سڑک پر ایک ٹیکسی دوڑنے لگی۔ ماجد چپ چاپ اگلی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ فش بھی خاموش پیچھے ہی پیچھے سرکتی ہوئی بلڈنگوں کو اچٹتی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ ولف نے خاموشی سے اکتا کر ماجد سے کہا۔

"تمہاری اس بیماری سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ تمہاری بکواس ختم ہوگئی۔ کیا اب ہمیں ہندوستان کے ان مشہور مقامات کی سیر نہ کراؤ گے۔ جنھیں تم مشہور و قابل دید مقامات سمجھتے ہو——"

ماجد نے کہا——

ہاں صاحب—— چلئے، اب صرف دو ایک مشہور مقام اور رہ گئے ہیں—— وہ بھی دکھادوں آپ کو!!

ایک اونچی عمارت کے قریب ماجد نے شوفر کو موٹر ٹھیرانے کے لئے کہا اور موٹر کا پچھلا دروازہ کھول کر ولف کو اتارتے ہوئے کہا "دیکھئے—— یہ ہندوستان کا مشہور کارخانہ ہے جہاں ہندوستانیوں کو بھکاری بننے کی تعلیم دیجاتی ہے۔ اسی کارخانے سے میں نے بی اے کی ڈگری لی ہے۔

لیکن فش موٹر ہی میں بیٹھی رہی۔ ولف نے جب اس سے اترنے کے لئے اصرار کیا تو اس نے کہا۔ میرے سر میں درد ہے۔

ماجد کے ہونٹوں پر ہلکی سی مبہم مسکراہٹ آگئی۔ یہ سر کا درد کیوں مول لے لیا بیچاری نے ——؟

واپس لوٹتے ہوئے ماجد کو سڑکوں پر لوگوں کا ہجوم اور دیواروں پر بڑے بڑے پوسٹر دیکھ کر دفعتاً کچھ یاد آگیا۔ اس نے ولف سے کہا۔

صاحب —— اب ایک آخری مشہور مقام اور دیکھ لیجئے —— اس کے بعد یہاں کوئی اور مقام دیکھنے کا نہیں

موٹر ایک بہت بڑے پنڈال کے پاس رک گئی۔ سینکڑوں ہندوستانیوں کا جم غفیر تھا وہاں پنڈال میں —— پنڈال کے وسط میں اسٹیج پر ایک نحیف الجثہ بوڑھا کھڑا انگریزی زبان میں تقریر کر رہا تھا۔ ولف کے پوچھنے سے پہلے ماجد نے کہا۔

صاب یہی ہے وہ چاکلیٹ کلرڈ کی ماؤس جو بھونکا وہ کر انگریزوں کو ڈراتا ہے —— مگر وہ کیا بولتا ہے —— آپ چسٹر فیلڈ اور چرچل کی تقریروں کو بھی بھول جائیں گے —— اس کی صورت اس کا لباس مضحکہ خیز ہوا تو کیا ہوا۔

چاکلیٹ کلرڈ کی ماؤس چیخ رہا تھا۔

ہندوستان ہندوستانیوں کے لئے چھوڑ دو۔

ہندوستان دیدو۔

آزادی دیدو۔

ولف کی رگوں میں جیسے خون کھول گیا۔ وہ تمتمایا ہوا فش کو لئے باہر نکلا۔ باہر بہت سے بھکاریوں کی کالی کلوٹی مرجھائی ہوئی ہتھیلیاں اس کے سامنے پھیلیں ——— ہتھیلیوں کے بھنور ——— بھنور کا شور!

ہندوستان ہندوستانیوں کے لئے چھوڑ دو!

ہندوستان دیدو!

آزادی دیدو!

ولف نے غصّے سے ان بھکاریوں کو جھڑک دیا۔

گیٹ آوٹ یو کی مائیس ———!"

ماجد ابھی موٹر میں بیٹھ ہی رہا تھا کہ اس کا ایک پڑوسی دوست ملا اور اس نے ماجد کو الگ لے جا کر کہا۔

"ارے کہاں غائب ہے تو! میں تجھے ہی ڈھونڈ رہا تھا ——— سلمیٰ کو ٹائیفائڈ ہو گیا ہے ——— وہ بار بار تجھے یاد کرتی ہے بحران کے عالم میں تیرا ہی نام لے کر پکارا کرتی ہے۔"

ماجد نے ایسا محسوس کیا جیسے رات کا اندھیرا دفعتاً ساری بمبئی پر چھا گیا۔ اور اس کی آنکھوں سے ٹوٹے ہوئے ستارے اس اندھیرے میں چمک رہے ہیں۔

فش نے ان آنکھوں کے ستارے دیکھ لئے۔ ماجد کو جھنجوڑ جھنجوڑ کچھ پوچھا ـــــ لیکن ماجد کو بھی جیسے دفعتاً ٹائیفائڈ ہو گیا تھا اور بحران کے عالم میں وہ پکار رہا تھا ـــــ سلمیٰ ـــــ سلمیٰ !!

جس وقت ماجد فش اور دلف سلمیٰ کے گھر پہنچے۔ سلمیٰ سو رہی تھی ـــ ایک ابدی نیند کا ایک طویل لامتناہی خواب دیکھ رہی تھی۔

سلمیٰ کا باپ آسمان کو آنسوؤں بھری نگاہوں سے گھورتا ہوا چیخ رہا تھا۔

ارے سلمیٰ کا باپ میں ہوں ـــــ میں اس کا بیاہ بڑی دھوم دھام سے رچانے والا تھا۔ سارے محلے والوں کو دعوت دینا چاہتا تھا ـــــ اب آسمان پر میری لڑکی کی مانگ میں کون افشاں بھرے گا ـــــ یہ محلے والیاں میری بیٹا کو دلھن بنا کیسے دیکھ سکیں گی ـــــ بول اے خدا ـــــ بول۔ میں نے . . . .

× × × × × ×

اور جس وقت سلمیٰ کا مرمریں جسم زمین کے حلق میں اتار دیا گیا اور مٹی کے ایک تودے میں ہمیشہ کے لئے چھپا دیا گیا۔ تو ماجد دیوانہ وار دوڑتا ہوا مٹی کے ڈھیر پر گر پڑا۔ مٹی کے تودے کو اپنی باہوں میں بھینچ بھینچ کر گرجتی آواز میں چیخنے لگا ـــــ

مادام ـــ آپ تاج محل دیکھنے سات سمندر پار سے آئی ہیں۔ یہ دیکھئے تاج محل! تاج محل یہی ہے۔ اس میں میری

جان میری روح میری ممتاز محل سو گئی ہے۔ وہ ظالم نیند کی بڑی متوالی ہے۔ اس کی آنکھوں کے کٹوروں میں ہمیشہ نیند بھری رہتی تھی ——— دیکھئے میں اس کو کتنے پیار سے بلا رہا ہوں۔ لیکن اس کی عشوہ طرازی دیکھئے ——— وہ خوابوں سے باہر ہی نہیں آتی۔ مادام ——— مادام!!"

بڑی دیر بعد فش اسے تسلی دلاسا دے کر تاج محل ہوٹل لے آئی۔

ماجد دو روز تک بستر ہی پر پڑا رہا۔ اسے جب ہوش آتا فش اس سے کہتی۔ تم ہمارے ساتھ نیویارک چلو۔ وہیں رہو۔ سلیمیٰ کو بھول جاؤ۔

لیکن ماجد دیوانہ وار ہنستے ہوئے وہی جملے دہراتا۔

سلیمیٰ کو بھول جاؤ ——— سلیمیٰ کو بھول جاؤ!!

فش جیسے شکست کھا گئی۔ اور اس نے ولف سے کہدیا کہ وہ کل ہی نیویارک واپس جانا چاہتی ہے۔ ولف بڑبڑانے لگا۔

تم جتنی خوبصورت ہو اتنی ہی پاگل بھی۔ وہاں میرا ناک میں دم کر دیا تھا کہ تاج محل دیکھوں گی ——— اب بمبئی ہی سے واپس لوٹ جانا چاہتی ہو ——— عجیب عورت ہو میں تو تمہیں سمجھ ہی نہیں سکتا!!

× × × × × ×
× × × × × ×
× × × × × ×

دوسرے دن وہ اسباب ٹھیک کر کے بندرگاہ پہنچ گئے۔ فنش نے ماجد کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں زور سے دبا کر آنکھوں کے ذریعے ایک بڑی لمبی کہانی کو سناتے ہوئے نوٹوں کی ایک گڈی ماجد کو دینی چاہی۔ لیکن ماجد نے نوٹوں کو لینے سے انکار کر دیا۔ ولف نے اس گڈی کو اس کی جیب میں ٹھونسنا چاہا۔۔۔ لیکن ماجد نے ایک حزیں، کھسیانی مسکراہٹ میں جواب دیا۔

مجھے روپیوں کی ضرورت نہیں۔۔۔ اب میں کیا کروں گا ۔۔۔ اب کوئی ضرورت نہیں۔ ہاں میری ایک استدعا ہے آپ سے ۔۔۔

ولف نے کہا۔

"ہاں ہاں کہو ۔۔۔!"

ماجد نے کہا ۔۔۔

"وہاں امریکہ میں سان فرانسکو میں ایک کانفرنس ہو رہی ہے۔ آپ اس کانفرنس میں ضرور شریک ہوئیے ۔۔۔ اور صرف یہ کہہ دیجئے کہ میں ہندوستان میں تاج محل دیکھ آیا ہوں ۔۔۔ بس!

ولف نے ماجد کی پیٹھ ملائمت سے تھپکتے ہوئے کہا۔

"آل رائٹ ۔۔۔ پور بوائے ۔۔۔

جہاز نے کوک دی۔ ولف نے ماجد کے ہاتھ کو زبردستی اپنے

ہاتھ میں لے کر مصافحہ کیا۔ فش نے ایک لمحہ کے لئے ماجد کو دیکھا۔

ماجد نے دیکھا کہ فش کی آنکھوں میں پانی جھلک رہا تھا۔ اس نے بھی آگے بڑھ کر شانے تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

غم نہ کرو ——— یہ زندگی ہے۔ اُس میں ایسا ہی ہوتا ہے

——— اچھا میری ایک یادگار اپنے پاس رکھو۔

فش نے ولف کے ساتھ تیز تیز جاتے ہوئے ایک منی پرس ماجد کی طرف پھینکا ———

ماجد جھلا گیا۔ منی پرس اٹھا کر وہ فش کی طرف لپکا۔ لیکن فش جہاز کے ڈیک پر پہنچ چکی تھی۔

جہاز رینگنے لگا۔ ماجد نے پرس کھول کر دیکھا۔ پرس بالکل خالی تھا البتہ سیلولائیڈ کے ٹکڑے کے پیچھے ایک ننھی سی تصویر میں ایک عورت جھانک رہی تھی۔ پرس کو اپنی مٹھی میں بھینچ کر وہ سمندر کی افقی لکیر پر سیاہ سیاہ دھبے کو دیکھنے لگا۔ مگر اس کی نظریں نیویارک کی چالیس منزلہ بلڈنگ کی، آسمان کی نیلاہٹوں میں گھسی ہوئی، بالکونی تک لمبی ہوگئی تھیں پوئر لوائے ———!

———+———

جیب

بی-اے کامیاب کرنے کے بعد میری زندگی اس کنگال لڑکی کا پیکر اختیار کر گئی جو نوجوان ہے۔ کنواری ہے خوبرو ہے، گلبدن ہے۔ لیکن کوئی اس کے خوابوں کا خریدار نہیں۔ میں نے بڑی سے بڑی کچہریوں سے لے کر اونچے سے اونچے محلات میں اپنی بی اے کی ڈگری —— کاغذ کا پرزہ —— پیش کرتے ہوئے کہا کہ میرا دماغ ارسطو، شیکسپیئر، ٹالسٹائی، نطشے، کارل مارکس، آئین اشٹائین، اور اقبال کے خزانوں سے مالامال ہے۔ میں تاریخ فلسفہ معاشیات سیاسیات عمرانیات سب پر کافی دسترس رکھتا ہوں۔ میرے بازو دں۔ میں دس دس گھنٹے تک لکھتے رہنے کی طاقت ہے۔ میری آنکھیں بارہ بارہ گھنٹے تک کتابیں پڑھ سکتی ہیں۔ ..... لیکن ——

بڑی سے بڑی کچہری نے جواب دیا۔

"ایک کلرکی کی جائداد ہے۔ تنخواہ تیس روپے!!"

بڑے سے بڑے محلات سے جواب ملا۔

"لڑکیوں کو پڑھاؤ تنخواہ بیس روپے!!"

یہ کیسا مذاق ہے ؟ مگر مجھے ایسے مذاق بہت پسند ہیں

جب میں یونیورسٹی میں پڑھتا تھا۔ تو میرے والدین مجھے پچاس روپے ماہوار بھیجا کرتے تھے۔ یعنی تیس روپیہ قیمت بیس روپیہ۔ اپنی طالب علمی کے ان بارہ پندرہ برسوں میں میں نے کتنے ہزار روپیے پانی کی طرح نہ بہا دیئے اتنی مہنگی تعلیم حاصل کرنے کے بعد یہ تیس اور بیس کا روپیہ کا مذاق ——— !بخدا مجھے اپنے آپ پر ہنسی آتی ہے ——— یہ ہنسی حیات افزا ہنسی نہیں ہے بلکہ کسی چھپے ہوئے مہلک مرض کی نشانی۔ کیا معلوم میں بھی قطب کی طرح خودکشی کروں۔ قطب نے جب اپنی تعلیم یافتہ بے روزگاری سے عاجز آکر خودکشی کی تھی تو میں نے اس پر لعنت بھیجی تھی کہ وہ بزدل تھا ——— مجرم جو زندگی سے ڈر کر بھاگ گیا۔ مگر اب میں قطب کو معاف کر دینے پر مجبور ہو گیا ہوں۔ زندگی بھی تو بازار کی ایک جنس ہے۔ بھلا جس کی جیب ہی خالی ہو وہ کیا زندگی کو خرید سکتا ہے۔

میرے والدین، میرے بھائی اور بہنیں میری طرف ایسی امیدوں بھری نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ جیسے میں بھی کوئی آسمان ہوں ——— بلاشبہ میں آسمان ہوں۔ دلفریب رنگوں کا مجموعہ اور پھر کچھ بھی نہیں ——— یا میری بی۔ اے کی ڈگری کے کاغذی پرزے کو فضا میں پھیلا دو۔ تو وہ خود ایک آسمان بن جاتا ہے۔ میری زندگی کے ریگستان کا خشمناک آسمان! ——— چمکتا ہوا جھلسا ہوا آسمان!

ایک دن میری بوڑھی ماں نے اپنا شفقت بھرا ہاتھ میری پیٹھ پر

پھیرتے ہوئے میری روح کے اندھیرے میں ایک نئی شمع جلانی چاہی۔
بیٹا —— موت وحیات خدا کے ہاتھ ہے جنگ میں بھرتی ہو جاؤ"
یہ ماں نے اپنے لخت جگر سے کہا۔ کچھ بھی ہو مفلسی نے ہندوستانی عورت کو بہادر تو بنا دیا ہے! اپنی عمر میں پہلی بار میں نے اپنی ماں کو حقارت بھری نظروں سے دیکھا۔ جیسے وہ اب ماں نہیں رہی ہے۔ بلکہ ایک بھکارن اور اس کی ممتا گڑگڑاتی ہوئی بھیک —— میں نے اس سے پوچھا ——

ماں —— میری پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کیا تمہارا ہاتھ ان ابھری ہوئی ہڈیوں اور پسلیوں سے نہیں ٹکرایا۔ جو منہ اٹھا کر فریاد کر رہی ہیں۔ میں کتابیں پڑھ پڑھ کر اب اتنا بزدل ہو گیا ہوں کہ ہاتھ میں صرف ایک ہلکا پھلکا قلم پکڑ سکتا ہوں —— تلوار نہیں۔ پھر یکایک طالسطائی میرے دماغ میں جاگ کر چیخنے لگا۔

لعنت ہے تم پر —— لعنت ہے!

لعنت بھیجے جاؤ طالسطائی! تم اگر زندہ ہوتے تو میں تم سے ضرور سمجھ لیتا۔ اب میں کیا کر سکتا ہوں۔

تیس روپے —— کاغذ کے تین پرزے ہیں، بیس روپے کاغذ کے دو پرزے، بی۔ اے کی ڈگری —— کاغذ کا ایک پرزہ، پیدا ہونے سے آج تک نہ میں زندگی کے پیچھے بھاگ رہا تھا اور نہ اس کے درخشاں مستقبل کے پیچھے۔ میں تو صرف کاغذ کے پیچھے

بھاگ رہا تھا۔ جو جلد پھٹ جانے والا، ناپائدار اور بے ثبات ہے۔

میرے ایک گریجویٹ دوست نے جو تیس روپے کے عوض کسی دفتر میں کلرک ہو گیا۔ ایک دن مجھ سے کہا۔

"صبر کرنا چاہیے۔ تم پاگل تو نہیں ہو گئے ———؟"

میں نے اس کے کوٹ کا کالر پکڑتے ہوئے پوچھا۔

میں پاگل یا تم ———؟ تم نے تیس روپے کے عوض اپنی زندگی۔ اپنا ضمیر، اپنی انا سب کچھ بیچ ڈالا۔ بی۔ اے کی ڈگری کا نرخ دنیا کے بازار میں اتنا گرا دیا کہ ایک گریجویٹ اور ایک اُجرتی مزدور میں کوئی فرق نہ رہا ——— اب کہتے ہو، صبر کرو......!

اس نے گھبرا کر کہا۔

اچھا بھائی۔ میرے کوٹ کا کالر تو چھوڑ دو۔ گریجویٹ ....."

میں نے اس کے کوٹ کا کالر چھوڑ دیا۔ جیسے کتے کے گلے میں پڑی ہوئی زنجیر...... اس وقت میں نے اس دوست پر ایک قہقہہ لگانا چاہا۔ مگر ناکام رہا۔ اب مجھے بہت افسوس ہوتا ہے کہ میں نے اپنی ساری ہنسی ہوسٹل کے کمروں اور دوستوں کی محفلوں میں فضول خرچ کر دی۔ اب شدید احساس ہوتا ہے کہ کاش کچھ ہنسی اور کچھ قہقہے

بچا کر محفوظ رکھ لیتا اور اپنی ہنسی کا زہر ان کھاتے پیتے انسانوں کی روح میں بھی ملا دیتا —— مگر اتنی دور اندیشی مجھ میں ہوتی تو بی۔ اے کرنے کے بجائے میں بازاروں میں کچالو کی چاٹ بیچتا ——

میرا دل مجھے تسلی دیتا ہے کہ تجھ میں جوہر ہے۔ زندگی میں اگر تیری قدر نہ ہوئی تو کیا ہوا۔ مرنے کے بعد دنیا تیرے لئے روتی رہے گی —— اور یہ صحیح ہے۔ یہ تعلیم وہ انعام غزنوی ہے جو فردوسی کی لاش کو نوازتی رہا جوہر . . . ! وہ تو سمندر کی تہہ میں ایک سیپ کے اندر بند ہے۔ جنگل میں کھلے ہوئے پھول کی طرح مسکرا رہا ہے۔ جہاں نہ بلبل ہے نہ گلچین۔ مسکراتے ہوئے کلی سے پھول بن جاؤ۔ اپنی خوبصورتی کی آپ ہی تعریف کرو۔ اپنی خوشبو آپ ہی سونگھو۔ اور جب تھک جاؤ تو مرجھا کر جاؤ۔

اقبال نے خواہ مخواہ ہی خدا کے آگے خم ٹھونک کر کہا ع۔

تو شب آفریدی چراغ آفریدم

چراغ آفریدم —— ! کیا چراغ نے رات کا اندھیرا دور کر دیا؟ پھر کس چیز پر نازاں ہے انسان؟ جب تک ایک ایک انسان کی قیمت چاندی کے سکوں سے ادا ہوتی رہے گی۔ دھرتی پر اندھیرا ہی چھایا رہیگا۔ وہ چراغ آفریدم کا دعویٰ صرف ایک شاعرانہ تعلّی تو ہے۔

ایک نوکری کے مقابلے کے امتحان میں شریک ہوا۔ جواب ملا "تمھاری صحت خراب ہے"

میں نے کہا۔

میں اس کا ذمہ دار نہیں ہوں۔ اس بی۔ اے کی ڈگری
سے پوچھو۔ جس کی خاطر میں نے اور میرے والدین نے
کیا کیا قربانیاں نہیں دی ہیں ــــــــ؟

انھوں نے قانون کی آڑ لی۔ میں نے وعدہ کیا کہ اس خراب صحت کے باوجود میں آٹھ کے بجائے دس گھنٹے تک کام کرنے کے لئے تیار ہوں۔ میرے قد اور سینے کا ناپ لینے اور مجھ جیسے بھوکے انسان کا وزن معلوم کرنے کے بجائے میری مجبور زندگی کو ناپو۔ اس احتیاط کا وزن دیکھو جو مجھے ہمالیہ کی چوٹیوں کی چڑھائی تک کو تیار کر دیتی ہے۔

مگر کچھ نہ ہوا۔ اور ہو بھی کیا سکتا ہے۔ میرے پاس نہ تو لاٹھی ہے اور نہ بھینس ــــــــ

میں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ جس دن میں پیدا ہوا تھا۔ وہ کوئی بڑا ہی مقدس دن تھا۔ وہ اس خوش فہمی میں مبتلا رہے کہ اس دن کا اثر میری زندگی پر بھی پڑے گا۔ آج تک یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ یہ دن کبھی مقدس اور کبھی منحوس کیوں ہو جاتے ہیں۔ جب کہ مقدس دن بھی وہی سورج طلوع ہوتا ہے۔ جو منحوس دن نکلتا ہے۔

مجھے سعد و نحس کے ان امتیازات سے کوئی دلچسپی نہیں۔ کیونکہ میرا دل ایک بجھا ہوا چراغ ہے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی مقدس دن نے اس چراغ کو روشن کر کے میری روح کا اندھیرا دور کر دیا ہوتا۔ میں جانتا ہوں کہ میری پیدائش کا دن اس لئے مقدس تھا کہ اس دن میں پیدا ہوا تھا۔

اور یہ بھی جانتا ہوں کہ جس دن میں مر جاؤں گا وہ دن میرے والدین کے لئے بڑا ہی منحوس ہوگا چاہئے اس دن ہندوستان کو سوراج ہی کیوں نہ مل جائے ——

میرے ایک کرم فرما بزرگ میرے چہرے پر چھائی ہوئی قنوطیت اور یاس کو دیکھ کر حیرت سے کہتے ہیں کہ یہ نئی نسل بھی عجیب بزدل ہے۔ پھر وہ اپنی بہادری ہمت اور جوشیلے کے قصے شروع کر دیتے ہیں۔ جی جب ہم جوان تھے ..... میں مانتا ہوں کہ جب آپ جوان تھے۔ آپ نے زندگی کو ہمیشہ ہتھیلی پر رکھا۔ نئی نئی سرزمینیں دریافت کیں۔ آسمان کی پہنائیوں میں چلے گئے۔ دھرتی کی جڑوں میں اتر گئے۔ اتال پاتال چھان ڈالا۔ مگر یہ تو بتایئے کہ اس زمانے میں ایک روپے میں کتنے سیر گیہوں ملتا تھا؟ کیا آپ کی جوانی کو غم عشق کے علاوہ کوئی اور غم بھی تھا ——؟ نئی نسل کی جوانی پر یوں طعن نہ کیجئے۔ غم عشق کے علاوہ غم روزگار سے جیسے اسے یرقان ہو گیا ہے مگر میں یرقان سے نہیں ڈرتا۔ بلکہ یرقان مجھے تمام بیمار بیماریوں سے زیادہ اچھا معلوم ہوتا ہے گیندے کے زرد زرد پھولوں میں بھی کاہے کو ایسا جمال ہوگا جو یرقان کی نظر افروز زردی میں گھلا ہوا ہے۔ یہ طنز نہیں بلکہ اس میں زندگی سے شدید بے ساختہ محبت کا رنگ چھلک رہا ہے۔ سچ مچ میں زندگی کو بہت پیار کرتا ہوں اسی لئے ایک اذیت کوش زندگی کے باوجود نہ فوج میں بھرتی ہوا اور نہ خودکشی کی۔ ایک بری زندگی کو ایک اچھی موت پر ترجیح دی۔ مزا تو زندہ رہنے میں ہے۔ ایک بار

مرنے میں وہ لطف کہاں -!

اب مجھے غلامی چاہیے۔ گاندھی کو ہندوستان چاہیے۔ جناح کو پاکستان چاہیے۔ ہم سب غلط راستوں پر چل رہے ہیں۔ صحرا میں گرد کے بگولے اٹھے تو سمجھا کہ لیلیٰ کی سواری آرہی ہے۔ صبح کاذب کو دیکھا تو پکار اٹھا کہ سرخ سویرا طلوع ہوگا۔ آزادی ملے گی، ملک ملے گا۔ پاکستان چاہیے! ہندوستان دیدو۔ مگر ہر سال یونیورسٹیوں سے جو لاکھوں جوانیاں غم روزگار کے مرض میں مبتلا ہو کر صحت گاہوں، ہسپتالوں، قحبہ خانوں، تالابوں اور ریلوے لائنوں پر زندگی سے نجات حاصل کر رہی ہیں۔ انھیں کوئی نہیں مانگتا کوئی مطالبہ نہیں کرتا کہ لاؤ ہمارے نوجوان ہمیں واپس دیدو۔ ہماری جوانیاں لوٹا دو۔ ان جوانوں کے بغیر پاکستان لے کر کیا کرو گے۔ ہندوستان لے کر کیا کرو گے ---؟

یا پھر ایسا کیا جائے۔ تم آزادی مانگو۔ میں غلامی مانگتا ہوں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے میری محبوبہ کے گلنار ہونٹ اتنے پسند نہیں جتنی غلامی پسند ہے۔ اور میری محبوبہ بھی یہی چاہتی ہے کہ مجھے نوکری مل جائے ——— مکار کہیں کی!

میری زندگی کے اور روتے ہوئے دنوں کی طرح ایک دن ایسا بھی آیا جب میری ماں کا بڑھاپا موت کے دروازے پر ختم ہو گیا۔ انسان کے زندہ جسم کی بھی ایک قیمت ہے اور مردہ جسم کے لئے کم از کم دو گز کفن کی ضرورت ہے۔ اس دو گز کپڑے میں

تین بچوں کی قمیص بن سکتی تھیں۔ ماں نے مرتے وقت اپنے بچوں کا حق بھی چھین لیا ـــــ مگر اس بیچاری کا بھی کیا قصور ـــــ زندگی بھر تو وہ خود بھی چیتھڑوں میں لپٹی رہی۔ اب آخری وقت ایک نیا اور ثابت کپڑا پہن لے تو کیا حرج ہے ـــــ؟

ماں کی موت کے بعد کھانے کا ایک پیٹ تو کم ہو گیا۔ لیکن خدا کی رزاقیت اور ستاریت وہیں رہی۔ سات آسمان پر ــ

ایک دن بہت مجبور ہو کر۔ بہت تنگ آکر میں نے اپنا عزیز ترین فاؤنٹن پن بیچ دیا۔ اور ایک جیب کاٹنے والی قینچی خرید کر فتو استاد کی شاگردی قبول کرلی۔ اس کے ٹھیک آٹھویں دن فتو استاد نے میری چابک دستی کی تعریف میں پیٹھ ٹھونکی ــ

اور اسی شام کو میں بے مطلب ادھر اُدھر بازاروں میں گھوم رہا تھا کہ ایک داڑھی والے مولانا۔ ایک شوخ و شنگ نوجوان لڑکی کے ساتھ ایک جگمگاتے سینما کے احاطے میں داخل ہوتے نظر آئے۔ میں لپک کر ان کے پاس پہنچا۔ اور پوچھا۔

"لائیے۔ ٹکٹ خرید دوں۔"

"نہیں نہیں، ہم خود خرید لیں گے۔"

جب میں سینما کے احاطے سے باہر ظفریاب مسکراتا ہوا نکلا تو مولانا کی شیروانی کا جیب باہر نکالا۔ اس جیب میں ایک گندہ سا رومال تھا۔ اور ایک سگریٹ کی ڈبیا اور ماچس۔

ٹھینگا تیری مولاتا کی......"

میں نے سگریٹ کی ڈبیا میں سے ایک سگریٹ نکال کر سلگایا۔ اور جیب اُٹھا کر دور سڑک پر پھینک دی۔ مگر ایک ادھیڑ عمر کا بھکاری دوڑا دوڑا آیا اور اس جیب کو اُٹھا کر وہیں سڑک پر بیٹھے بیٹھے اپنی میلی تار تار قمیص پر ٹانکنے لگا میں نے سوچا اس قمیص کو جیب کی ضرورت ہی کیا ہے یہ جیب بھی ایک دن پھول کر کُپّا ہو جائے گی۔ اور...... اسی لئے دوڑ کر میں نے اس سے وہ جیب چھین لی۔ جیسے اس بھکاری کو سرمائے کی لعنت سے بچا لیا۔

——(پشو)——

وہ شعلہ جسے چھو نہ سکا

سعیدہ کو جب میں نے پہلی بار دیکھا تو اس کے بعد سے مجھے ہر رخ گلابی مرمریں، روپہلی، سنہری بلکہ ہر رنگ کی لڑکی پھیکی پھیکی نظر آنے لگی۔

——سعیدہ—— وہ سعیدہ جو گہرے سبز رنگ کی ساڑی کھڑی لکیروں والا پیلا بلاؤز پہنے۔ گداز بھرے بھرے شانوں پر کالی کالی زلفیں بکھیرے پتلے پتلے عنابی ہونٹوں میں ٹیڑھے دلآویز تبسم خم بناتی ایسے لچکتی جیسے اس کی کمر میں ریڑھ کی ہڈی کی جگہ بید لگی ہو۔ میری آنکھوں کے آگے آئی تو میں نے ایسا محسوس کیا جیسے میں نے دنیا میں پہلی بار حسن دیکھا ہے۔ اب تک تو میری آنکھیں جیسے صرف رنگ اور چمک دیکھتی رہی تھیں۔ حسن کہاں دیکھا تھا——!

اس کے سرخی مائل سپید چمکیلے چہرے کے نور سے میری آنکھیں چندھیا سی گئیں اور وہ ویران وسنسان راستہ جو میری آنکھوں سے میرے دل تک کسی کے نقش پا کو ترستا اندھیرے میں چھپا ہوا تھا سعیدہ کے چہرے کی چکا چوند کر دینے والی روشنی سے منور ہو گیا۔ سعیدہ اسی راستے پر چلتی ہوئی آئی اور میرے ویران خانۂ دل میں آباد ہو گئی اور میرا دل کسی شاہ زادی کی خوابگاہ کی طرح روشن ہو کر جگمگانے لگا۔

میری بیروزگار زندگی کا سارا اندھیرا دور ہو گیا۔ سعیدہ کے جسم کا سونا اس کی آنکھوں کے ہیرے، اس کے دانتوں کے موتی، اس کے گالوں کے لعل، اس کے ہونٹوں کے عقیق، اس کے جسم کے عطر اور اس کی زلفوں کے ریشم سے میرا دل قاروں کے خزانے کی طرح بھر گیا۔ بخدا میری مفلسی دور ہو گئی!۔

سعیدہ کا گھر میرے گھر کے بالکل سامنے تھا۔ درمیان میں ایک بارہ فٹ چوڑی سڑک۔ حائل تھی۔ لیکن میرے اور سعیدہ کے درمیان کچھ بھی تو حائل نہ تھا۔ وہ تو میرے دل میں رہتی تھی۔ اور جس وقت میں سانسوں ہی سانسوں میں اس کو پکارتا ——— "سعیدہ!" تو سعیدہ میرے دل کے کواڑ کھٹکھٹانے لگتی دھڑک، دھڑک........ دھڑک دھڑک۔ یہ میرے دل کی دھڑکن نہیں یہ تو سعیدہ میرے دل کے کواڑوں پر دستک دے رہی ہے۔

سعیدہ کی ماں اور میری ماں بڑی جگری سہیلیاں تھیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میری ماں بھی حد درجہ باتونی تھی اور سعیدہ کی ماں بھی ——— جب تک وہ دونوں چھالیہ کاٹتی۔ سروتے کھٹکھٹاتی۔ دو تین گھنٹے ایک دوسرے سے باتیں نہ کر لیتیں۔ دونوں کو چین نہ آتا۔

شام ہوتے ہی سعیدہ کی ماں ہمارے گھر آجاتی اور اس کے ساتھ سعیدہ بھی ——— وہ سعیدہ جو ممتاز ہے حسینانِ جہاں میں.....!
عرصے تک سعیدہ نے مجھے نہیں دیکھا۔ مگر میں سعیدہ کو کھڑکیوں سے

چلمنوں سے دروازوں سے کواڑوں سے چھپ چھپ کر روزانہ دیکھا کرتا تھا اور جب سعیدہ اپنے گھر چلی جاتی تب بھی میں اس کو دیکھا کرتا تھا۔ وہ ہر لمحہ میری آنکھوں کے آگے لچکتی اٹھلاتی۔ مسکراتی شرماتی نظر آتی تھی۔ وہ میرے لئے غیر فانی ہو گئی تھی۔ سعیدہ کا جسم تو ایک ہی تھا۔ لیکن اس کی ہیئتیں لاتعداد تھیں۔ میں ہر دم ہر لمحہ ہر ساعت اس کی نئی نئی ہیئتیں دیکھا کرتا تھا۔ لیکن وہ مجھ سے دور دور ہی رہی ——— خلاؤں میں فضاؤں میں، خوابوں میں، ——— اس کو چھونا چاہتا تھا۔ اس کے جسم کی رعنائی لذت کو محسوس کرنے کی ایک بے پناہ آگ میرے دل میں بھڑک رہی تھی۔ لیکن فضاؤں میں اڑنے والی خوش رنگ تیتری خلاؤں میں ناچنے والی پری اور خوابوں میں خرام فرمانے والی شہزادی کے جسم کا رعنائی لمس کس نے محسوس کیا ہے۔

میرا ایک راز دان دوست مجھے اکسایا کرتا ———

"ارے سب کچھ ممکن ہے۔ تھوڑی سی ہمت کی بات ہے مجھے موقع ملے تو میں کوہ قاف کی پریاں اڑا لاؤں"

لیکن میں سعیدہ کو اپنی زندگی میں اس طرح نہیں لانا چاہتا تھا میں چاہتا تھا کہ خود ہی چلی آئے ——— یہ رضامندی عشق یہ لذت عشق . . . . . . ورنہ پیسے کی چمک سے تو کوہِ قاف کی پریوں سے زیادہ خوبصورت عورتیں حاصل کی جا سکتی ہیں۔

مجھ میں میرے راز دان دوست کی طرح ہمت ہی نہیں تھی اور

میں سعیدہ سے مایوس سا ہو جا رہا تھا۔

لیکن ایک دن مایوسی کی آندھی جیسے تھم گئی۔ اور امید کی شمع پھر سے اپنے منوّر شعلے کا تاج سر پر اٹھائے جگمگانے لگی۔

اس دن میں نے اپنے چھوٹے بھائی کو اس بات پر خوب پیٹا تھا کہ اس نے میرے کمرے سے پھر دو کتابیں غائب کر دیں۔ وہ ہمیشہ میری کتابیں اڑا کر اپنے دوستوں کو دیدیا کرتا جو کبھی واپس نہ ہوتی تھیں۔ جب وہ خوب پٹ کر رونے لگا تو اماں اندر سے دوڑی دوڑی آئیں اور کہا۔

بیٹا —— مجید نے کہاں لی ہیں تمہاری کتابیں۔ سعیدہ آج مجھ سے تمہاری وہ کتابیں مانگ کر لے گئی ہے —— وہ مجھ سے پوچھ کر لے گئی ہے۔"

"سعیدہ ——" چونک کر میں نے اپنے بھائی کی گردن چھوڑ دی اور خوشی سے بے ساختہ کھلے ہوئے منہ سے ماں کے چہرے کو دیکھا میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ جیسے سعیدہ میرے دل کے کواڑ کھٹکھٹا رہی ہو، دھڑک دھڑک ..... دھڑک دھڑک !!

میں ایک لمحہ کے لئے بالکل ہی بھول گیا کہ میں ہوں میں۔ میرے سامنے میری ماں اور میرا چھوٹا بھائی ہے۔ اور یہ دنیا دنیا ہے —— میں تو جیسے خلاؤں میں ناچنے والی پری کو پکڑنے آسمانوں میں اڑا جا رہا تھا۔

دفعتاً وہ پری غائب ہو گئی اور میری اماں کی پوپلی آواز نے مجھے چونکا دیا —— اگر تمھیں اُن کتابوں کی ضرورت ہے تو ابھی منگوائے

دیتی ہوں۔ اے رحیمن —— دیکھ تو۔ ذرا سعیدہ بی بی کے گھر جا اور ....میں نے گھبرا کر جلدی سے کہا۔

نہیں ماں —— مجھے اُن کتابوں کی ابھی ضرورت نہیں تعیہ.... "یعنی وہ اگر پڑھنا چاہیں تو پڑھنے دیجئے کیوں منگواتی ہیں خواہ مخواہ ——"

ماں چھوٹے بھائی کے سر پر ہاتھ پھیرتی ہوئی چمکار کر دلاسا دینے لگی۔

نُوحق مارا میرے لال کو —— آج ہی میں منگوائے دیتی ہوں تجھے اچھی اچھی سی کتابیں۔ اس سے بات نہ کر —— وہ ظالم ہے "

میں مسکراتا ہوا اپنے کمرے میں چلا آیا۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر مسکراتے ہوئے اپنے عکس سے پوچھا۔

یار —— ماں کہتی ہے کہ میں ظالم ہوں۔ وہ بےچاری کیا جانے کہ ظالم کون ہوتا ہے۔ ارے ظالم کی تو لمبی لمبی چمک دار زلفیں ہوتی ہیں۔ ظالم تو گہرے سبز رنگ کی ساڑی اور رکھڑی لکیروں والا پیلا پیلا بلاوز پہنتی ہے۔ ظالم ظالم سعیدہ!

پھر چند ہی دنوں بعد میں سعیدہ کو خود ہی ناولوں اور افسانوں کی کتابیں دینے لگا۔ ایسے ناول اور افسانے جن کو پڑھ کر وہ خود کو بھی کسی ناول یا افسانے کی ہیروئن سمجھنے لگے۔ میری یہی خواہش تھی کہ وہ خود کو ہیروئن سمجھنے لگے۔ ایسی ہیروئن جس کی بڑی بڑی سرمگیں آنکھوں میں کسی ہیرو کا انتظار ہو۔

نہیں نہیں ——— کسی ہیرو کا نہیں ——— میرا انتظار ہو۔ یہ فال بد ہو گی کہ وہ کسی ہیرو کا انتظار کرے۔ وہ صرف میرا انتظار کرے۔ صرف میرا ورنہ میں زندہ نہ رہ سکوں گا۔ ایک پل۔ ایک لمحہ نہ جی سکوں گا۔

ایک رات کتابیں دینے کے بہانے میں سعیدہ کے گھر گیا۔ گھر میں سعیدہ اور ایک بوڑھی باورچن کے سوا کوئی نہ تھا۔ سعیدہ کی ماں کہیں مہمان گئی ہوئی تھیں سعیدہ صحن میں ٹیلیفون کے تاروں میں الجھے ہوئے شرمیلے چاند کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ایک آرام کرسی پر دراز تھی۔ وہ سفید بوسکی کا قمیص سرمئی رنگ کی کلف دار شلوار پہنے ہوئے تھی۔ ایک ململیں دوپٹہ اس کی لمبی گردن کے گرد بل کھا کے سینے پر ہوا کے جھونکوں سے پھڑ پھڑا رہا تھا۔ چاند کی کرنیں اس کے ہونٹوں، اس کے رخساروں اس کی پیشانی اس کے پپوٹوں اور ابروؤں کو چوم رہی تھیں۔ وہ چاند کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھیں، لڑکیاں چاند کو کیوں گھورتی ہیں ——— میں سعیدہ کو اس لئے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا کہ مجھے اس سے محبت ہے۔ مگر سعیدہ کو چاند میں کون نظر آرہا ہے۔ میرے دل میں شک کا سانپ پھنکارنے لگا

——— سعیدہ کا محبوب کون ہے۔ کون ہے سعیدہ کا محبوب؟

میں آگے بڑھنے لگا۔ میرے قدموں کی چاپ سے وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے مصنوعی مسکراہٹ سے اسے دیکھا۔

اور پھر ہم بڑی دیر تک میٹھی میٹھی باتیں کرتے رہے جب میں گھر جانے کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا تو سعیدہ نے کہا۔

آپ کی باتوں سے کیا شگفتہ ہوئی ہے طبیعت ——— اگر آپ کو فرصت ہو تو کبھی کبھار آجایا کیجئے۔ میری طبیعت آج کل اداس سی رہتی ہے۔ بھلا کوئی کب تک کتابیں پڑھتا اور گلوریاں چباتا رہے ———

"آپ یہاں سے چلے جاتے ہیں تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی ویران مندر میں کوئی بھولا بھٹکا مسافر آیا ہو۔ اور مندر کی گھنٹیاں بجاکر پھر اپنے سفر پر چلا گیا ہو ———"

سعیدہ کے یہ جملے سن کر میں ضبط نہ کر سکا اور بے اختیار بولا۔

"اور میں . . . اور میں جب یہاں سے چلا جاتا ہوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اس مندر کی گھنٹیاں گونج گونج کر کہہ رہی ہیں مسافر تو اپنی منزل مقصود سے آگے نکلا جا رہا ہے۔" اندر سے سعیدہ کے ابا کے بھاری بھرکم قدموں کی چاپ سنائی دی اور میں نے سعیدہ کا مرمریں مخملیں ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبا کر اس کی کلائیوں کی چوڑیاں جھنجھنا دیں جیسے مسافر نے مندر کی گھنٹیاں بجادی ہوں۔

گھر پہنچ کر میں سب سے پہلے آئینے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ میرا عکس مسرت سے جیسے سرخ ہو رہا تھا۔ مسکرا رہا تھا۔ میں نے اپنے عکس سے پوچھا۔

"دوست ——— سعیدہ کی طبیعت شگفتہ ہو گئی۔ وہ ہیروئن بن گئی آج۔ آج اس نے اپنے آپ کو کھو دیا ——— اب بتا تیری کیا رائے ہے۔ میں سعیدہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں ———"

میرے عکس کی باچھیں کھل گئیں۔ جیسے اس سوال کا جواب اس کی باچھوں میں بندھا تھا۔ وہ رات میرے لئے اتنی لمبی ہو گئی تھی کہ کاٹے نہ کٹی۔

× × × × × × ×

اس کے بعد سے زندگی ایک رقاصہ کی طرح رنگ برنگی لباس پہنے رنگ و بو کا طوفان اُٹھائے پائلوں اور چوڑیوں کی موسیقی بکھیرنے ناچنے لگی۔

* * * * * * * *

لیکن ایک دن دفعتاً زندگی کا رقص رک گیا۔ پائلوں اور چوڑیوں کی موسیقی مر گئی۔ سعیدہ گھبرا کر میرے دل کے کواڑ کھٹکھٹانے لگی۔ ۔ دھڑک دھڑک ..... دھڑک دھڑک۔"

شہر کا ایک بڑا دولت مند اس کا تعاقب کر رہا تھا اس کو مجھ سے چھین لینا چاہتا تھا۔ سعیدہ کو حاصل کرنے کے لئے اس نے کئی تجوریوں کے منہ کھول دئے تھے۔ سعیدہ میرے دل کے کواڑ کھٹکھٹاتی رہی۔ لیکن میری مفلسی نے میرے دل کے کواڑوں پر زنگ آلود تالے ڈال رکھے تھے رات سعیدہ کے گھر ہزاروں رنگ برنگی قمقموں سے چراغاں ہو گیا۔ باجوں ڈھولوں تاشوں اور نفیریوں کے شور میں ایک تشنہ کام محبوبہ اور ایک مجبور کنواری کی سسکیاں بالکل ہی فنا ہو گئی تھیں ——

بڑی دیر تک میں سگریٹ پیتا شعلہ بار آنکھوں سے چندھیا دینے والی روشنی کو دیکھتا رہا اور جانے کیا سمائی کہ سعیدہ کے گھر گیا۔ تنہائی میں موقع پا کر اس جانوروں کی دنیا سے جہاں پیار بکتا ہے جہاں دل کی دھڑکنیں

فروخت ہوتی ہیں، جہاں لڑکیوں کا نیلام ہوتا ہے، جہاں زلفوں کی قیمت مقرر کی جاتی ہے۔ بھاگ چلنے کو کہا۔ وہ انکار کرنے لگی۔ وہ ہندوستان کی پاگل ڈرپوک بزدل لڑکی ؟ میں نے بے رحمی سے اس کی نازک کلائی پکڑ کر اسے بہ جبر کھینچ لے جانا چاہا۔ لیکن اس کی سہیلیوں کی چوڑیوں اور پازیبوں کی جھنکار قریب آتی سنائی دی۔ جب سعیدہ نے آخری بار "نہیں" کہا میں نے غضبناک ہو کر اس کے ملائم سرخ رخسار پر ایک زوردار طمانچہ لگا دیا —— سعیدہ نے ایک لمحہ کے لئے پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھا، پھر اپنی سرخ سرخ شرابی آنکھیں مخملیں پپوٹوں سے ڈھانک لیں۔ اور میں نے ایسا محسوس کیا جیسے میخانے کے دروازے مجھ پر ہمیشہ کے لئے بند ہو گئے۔

ایک مفلس شرابی کی طرح تشنہ کام میں باہر نکل آیا۔ رات کی گھنیری زلفوں میں ستارے ٹنک گئے تھے۔ سعیدہ کا باپ پرانے بغداد کے لونڈیاں بیچنے والے سوداگر کی طرح اپنی بڑی بڑی مونچھوں پر تاؤ دیتا ہنس ہنس کر لوگوں سے باتیں کر رہا تھا۔

معاً باجوں ڈھولوں تاشوں اور نفیریوں کا آسمانوں کو ہلا دینے والا شور بلند ہوا۔ ایک خوش رنگ موٹر میں ایک سرخ گٹھری رکھ دی گئی اور ایک پھولوں میں لدا پھندا دولھا۔ میرا رقیب مسکراتا ہوا موٹر میں جا بیٹھ گیا۔ میں دیکھتا رہا۔ موٹر رینگنے لگی۔ دولھا وہ سرخ گٹھری اڑائے لئے جا رہا تھا۔ جس میں کسی مفلس تشنہ کام عاشق کی محبوبہ کے جسم کا سونا!

آنکھوں کے ہیرے، دانتوں کے موتی، رخساروں کے لعل، ہونٹوں کے عقیق، جسم کا عطر، زلفوں کا ریشم بندھا ہوا تھا۔ لیڈر اکسی کا متاعِ حیات اڑائے لئے جا رہا تھا۔

باجے۔ ڈھول۔ تاشے مجھ زور زور سے قہقہے لگا رہے تھے۔

میں ہجوم سے باہر نکل آیا۔ اپنے دونوں کانوں کو ہتھیلیوں سے بند کئے بھاگنے لگا۔ بھاگتا رہا ——— بھاگتا رہا۔ لیکن باجوں اور نفیریوں کے قہقہے میرے تعاقب میں دوڑ رہے تھے ——— پیں پیں ——— پیں پیں ہوں ہوں ——— ہوں ہوں۔ میں بھاگتا رہا۔ اور پھر ایک چٹیل سنسان میدان میں تھک کر زمین پر گر پڑا۔ اوا ترین میرے سر پر منڈلا منڈلا کر میری شکست پر ٹھٹے اڑا رہی تھیں کالے آسمان پر سعیدہ کے بے شمار آنسو جگمگا رہے تھے۔ اور چاروں طرف گہرا اندھیرا ناچ رہا تھا۔

عورت اور عورت

میری بوڑھی ماں کے سفید بالوں اور چھینٹ کے جزدان میں لپٹے ہوئے قرآن شریف نے سارے گھر پر ایک ایسی سنجیدگی سناٹا اور بڑھاپا طاری کر رکھا تھا کہ گھر میں قدم رکھتے ہی میری جوانی مجھے الٹے پاؤں بھاگ جانے پر مجبور کر دیتی تھی۔ اب میں زندگی کی اس منزل سے گزر رہا تھا۔ جہاں مجھے بڑھاپے کی شفقت سے زیادہ جوانی کی محبت کی ضرورت تھی میری جوانی ایک اور جوانی کی محتاج تھی ——— یہی بات تھی کہ مجھے گھر سے نفرت سی ہو گئی تھی اور اس سمنٹ روڈ سے عشق ہو گیا تھا جو زلف کی طرح بل کھاتی ہوئی عطیہ کے گھر کی طرف چلی گئی تھی ——— مگر گھر سے مفر بھی تو نہیں ———!

عطیہ میری خالہ کی لڑکی تھی۔ عطیہ میرے خوابوں کی لڑکی تھی میں ہر شام عطیہ کے گھر جاتا تھا۔ اور عطیہ سے ہر روز ملنے کے باوجود بھی میں عطیہ تک نہ پہنچ سکا تھا۔ میں نے عطیہ کے قالب میں اس عطیہ کو پیدا کرنے کی بے انتہا کوشش کی جو مجھے دیکھتے ہی شرما کر سرخ ہو جائے اور شکاری کو دیکھ کر گھبرائی ہوئی ہرنی کی طرح کہیں چھپنے

کے لئے بھاگ جائے۔ مگر اس کے جسم میں تو جیسے خون ہی نہیں تھا پھر وہ سُرخ کیسے ہو جاتی ——— ؟

ایک دن مجھے معلوم ہو ہی گیا کہ بات کیا ہے ——— ؟ گو یہ صحیح ہے کہ عطیہ کی ماں میری ماں کی سگی بہن ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ ایک ہیڈ کلرک کی بیوی بھی ایک ہیڈ کلرک کی زوجگی ایک مفلس بہن کے بہناپے سے زیادہ مضبوط رشتہ تھا۔ اُس دن میری خالہ نے عطیہ کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے بالآخر کہہ دیا۔

"جلال ——— تم دیکھ رہے ہو عطیہ کو۔ پڑھائی میں اسکول کی ساری لڑکیوں میں بازی لے گئی ہے۔ میں تو اپنی عطیہ کو ام۔اے تک پڑھاؤں گی۔ کیا سمجھے ——— ؟ اور پھر۔۔۔

اس کے بعد جو جملہ میں نے سنا۔ وہ میرے دل پر ایک کاری ضرب لگاتا ہوا نکل گیا۔ میں خالہ کو بتا دینا چاہتا تھا کہ وہ اپنی لڑکی کے ساتھ دشمنی کر رہی ہیں۔ کیونکہ عطیہ کو ایسے انسان کی ضرورت نہیں جو روپے گنتے گنتے تھک جائے اور تھک ہار کر بہت جلد سو جائے۔ عطیہ کو تو ایک ایسے انسان کی ضرورت ہے۔ جو عطیہ کی اتنی پرستش کرے کہ عطیہ کے گالوں میں دوامی سُرخی پیدا ہو جائے۔ اور اس کی آنکھوں کے ستارے کبھی نہ ٹوٹ سکیں اور شاید قدرت نے بھی اسی لئے عطیہ کو اتنا خوبصورت بنایا تھا۔

خالہ کا جواب سن کر بھی میں عطیہ سے مایوس نہ ہوا۔ بلکہ اسی طرح

ہر روز عطیہ کے گھر جاتا اور کئی کئی گھنٹے اس سے باتیں کرتا محض اس لئے کہ وہ کسی دن اسے یہ معلوم ہو جائے کہ وہ صرف ایک ہیڈ کلرک کی بیٹی نہیں ہے بلکہ کسی کے خوابوں کی محبوبہ بھی ہے۔

ہر روز ایک جگمگاتا دن ایک جگمگاتی امید لئے طلوع ہوتا اور پھر ایک اندھیری رات کے اندھیرے میں چھپ جاتا۔ یہ اندھیرا کیا بلا ہے۔ عطیہ نہیں جانتی تھی کیونکہ بجلی کے جگمگاتے قمقمے اندھیرے کو اس کے گھر میں کبھی گھسنے ہی نہ دیتے تھے۔ اور میرے گھر مٹی کے تیل کا ایک چراغ جلتا تھا۔ اس مٹی کے تیل میں میرے دو روپوں کا گاڑھا پسینہ بھی شامل ہے ——— دو روپوں میں بتیس آنے ہوتے ہیں اور زندگی میں صرف سانسیں . . . . . .

ہیڈ کلرک کی عطیہ میں میری عطیہ پیدا نہ ہو سکی۔ اور زمین ویسے ہی گھومتی رہی سورج مشرق سے ہی طلوع ہوتا رہا۔ اور مغرب میں ہی غروب ہوتا رہا۔ اور میرے گھر مٹی کے تیل کا ایک ہی چراغ جلتا رہا۔ اس کی مدھم روشنی میں چاہے ٹھوکر کھاؤ۔ چاہے سنبھل جاؤ۔

تنگ آکر ایک دن تڑپاتے تڑپاتے میں نے اپنی خالہ سے التجا کی کہ میں سنبھل جانا چاہتا ہوں۔ میری خالہ دنیا دیکھی ہوئی عورت ہے۔ اس نے سیدھے جواب کے بجائے ایک ٹیڑھا جواب دیا۔

"بیٹا ——— خوب جی لگا کر محنت کرو چالیس کے پچاس ہو سکتے ہیں۔ دیکھا جائے گا۔ اللہ میں بڑی قدرت ہے"

اللہ ــــــــ مگر کہاں ہے وہ اور اس میں کونسی وہ طاقت ہے۔
مجھے تو کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ یا تو ایک ماہر ریاضی داں ہے یا کوئی
بڑا میکانیکل انجینیئر۔ وہ تو صرف ایک ہی طرح کے نظام کائنات ترتیب
دینے کی قوت رکھتا ہے۔ سورج مشرق سے نکال دے اور مغرب میں ہی
غروب کر دے۔ صدیوں سے یہی ہوتا چلا آرہا ہے۔ مگر کبھی ایسا نہیں ہوا
کہ سورج مغرب سے طلوع ہوا ہو اور عطیہ کا تغافل محبت میں بدل گیا ہو۔
خدا کی کائنات، تو ایسی چل رہی ہے جیسے کوئی ویل رگولیٹیڈ واچ ــــــــ
ٹک ٹک ــــ ٹک ٹک ــــــ عطیہ کی بھی ایک ہی لے اور ایک ہی
رفتار ــــــ تغافل ہی تغافل . . . . . .

میری خالہ کا شاید یہی خیال تھا کہ عطیہ تک پہنچنے کے لئے میں نے
چالیس روپیہ ماہوار کی جو چھوٹی سی پگڈنڈی بنائی ہے۔ اگر اس پگڈنڈی
پر تھوڑی سی چاندی اور ڈال کر اس کو واضح اور چمکدار بنا دیا جائے تو
شاید وہ میری زندگی کا مستقل راستہ بن جائے ــــــــ میں نے بھی
جان کی بازی لگا دی۔ دفتر کے علاوہ ایک اخبار کے دفتر میں رات میں
مزید تیس روپیہ ماہوار کام کرنے لگا۔ اس اضافے سے میں خوشی سے
دیوانہ ہو گیا۔ خدا کی بارگاہ میں گڑگڑا کر بڑی ندامت سے معافی چاہی کہ
میں نے اس کو ریاضی دان اور میکانیکل انجینیئر جیسی خرافات باتیں بک
رکھی تھیں ــــــ خدا واقعی عفو اور رحم والا ہے ــــــ وہ جانتا ہے
کہ ہم جیسے نا تجربہ کار نوجوان جب کسی مہم میں ناکام ہو جاتے ہیں۔ تو

بے سوچے سمجھے بکنے لگ جاتے ہیں۔ جیسے کتے بھونکا کرتے ہیں۔ چاند پر خاک اڑانا یا خدا کو کوسنا بے وقوفی نہیں تو اور کیا ہے۔ میں نے اس دن بڑی لمبی لمبی نمازیں پڑھیں۔ ماں کے قدموں میں گر پڑا چھینٹ کے جزدان میں لپٹے ہوئے قرآن شریف کو چومتا۔ آنکھوں سے لگاتا۔ اس جنت میں بھی داخل ہو گیا جہاں عطیہ کے عقیقی ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی اور میری خالہ کی جھریوں میں ایک مسرت انگیز ارتعاش جیسے وہ اب رجعت پسند نہیں رہی ہے۔

میں امیدوں سے بھرا دل لئے دوڑا دوڑا خالہ کے گھر گیا۔

انھیں یہ خوشخبری سنائی مگر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ انھوں نے سنا ضرور ——— مگر اس لئے کہ اُن کے کان کھلے ہوئے تھے۔ عطیہ نے بھی سنا۔ مگر اس کے پہلو میں گوشت کے لوتھڑے کے بجائے جیسے برف کا ٹکڑا رکھا ہو۔

عطیہ عطیہ ہی رہی۔ ایک ہیڈ کلرک کی بیٹی۔ اور اس کی ماں کے خیال کے مطابق کسی کلکٹر کی ہونے والی بیوی۔

ستر روپے میں کتنی چاندی ہوتی ہے اور میرے جسم میں اب اور کتنا پسینہ رہ گیا ہے ——— ؟ کیسے الجھے میں پھنس گئی ہے زندگی میں عطیہ سے جتنا مایوس ہوتا جاتا ہوں اتنی ہی تیزی سے میرے دل میں آرزوئیں ابلتی ہیں۔

مجھے ایک دن مضمحل تھکا ماندہ اور مایوس دیکھ کر میری بوڑھی ماں نے کسی پرانے تجربے کا ذکر کرتے ہوئے اس کا نتیجہ سنایا کہ آرزو کا پورا نہ ہونا

ہی زندگی کا اصلی مزہ ہے۔ اسی سوز میں جلنا اور جلتے رہنا انسان کی شان ہے ـــــــ اس وقت میں نے اس کی آنکھوں میں وہ درد بھی دیکھ لیا تھا جس نے اس کو یہ نصیحت کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

اس روز روز کی بے التفاتیوں اور سرد مہریوں نے مجھے ایک دن اتنا مجبور کر دیا کہ میں نے تہیہ کر لیا کہ عطیہ کو آج صرف آخری بار دیکھنے جاؤں گا اور اس کو سنا دوں گا کہ اگر میں عطیہ میں ایک اور عطیہ پیدا کرنے کی کوشش کے بجائے کسی پتھر کی مورت کو زندہ کرنے کی ریاضت کرتا تو میری ریاضت ضرور کامیاب ہو جاتی۔ اور اس کو صاف صاف سنا دوں گا کہ آج سے میں اس کو بالکل بھول جانے کی کوشش کروں گا ـــــــ بالکل ہی بھول جاؤں گا۔

اس طرح اپنے آپ سے بھولا میں عطیہ کے گھر گیا۔ عطیہ اپنے کمرے میں اکیلی بیٹھی ہوئی تھی۔ ادھر ادھر کی خانگی گفتگو کرنے کے بعد میں نے مسکراتے ہوئے عطیہ سے پوچھا۔

"عطیہ ـــــــ تمہاری شادی کب ہو گی"؟

"نہیں بھائی جان ـــــــ میں شادی کبھی نہیں کروں گی"!

میں نے یہ سوال اس لئے کیا تھا کہ شادی کا نام سن کر عطیہ بھی عام نوجوان لڑکیوں کی طرح شرما کر نظریں جھکا کر اپنی مسکراہٹ روکنے کی کوشش کرے گی۔ مگر وہ تو ایک انگریزی اسکول کی طالب علم تھی اور اس کی ماں اس کو کسی انگریزی تہذیب کے دل دادہ کلکٹر کے لئے

تیار کر رہی تھی۔ اس غیر متوقع جواب کے باوجود میں نے ذرا بے تکلف ہو کر کہا۔

"ہوں ۔۔۔۔۔۔ مگر یاد رکھو ایک دن ایسا بھی آنیوالا ہے
جب کوئی تم سے تمہاری ساری شوخی چھین لے گا تم
اپنا سب کچھ اس کو سونپ کر ہمیشہ کے لئے اس کی ہو جاؤ گی۔"

"مگر کس کی۔ یہ آپ نے نہیں بتایا۔" اس کے تبسم ہونٹوں نے جھٹ سے پوچھا۔ میں نے لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں کہنا شروع کیا۔

"کسی کی بھی ۔۔۔۔۔۔ کوئی نہ کوئی مرد ایسا ہو گا جس کی پسلی سے تم پیدا ہوئیں۔"

اس نے جواب دیا۔

"جلال بھائی میں سمجھتی ہوں کہ آپ یہ سب کچھ کیوں کہہ رہے ہیں" یہ کہہ کر وہ مسکراتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

میں شاداں و فرحاں گھر لوٹا۔ میری ریاضت، بالآخر پھل لے آئی۔ عطیہ میں وہ عطیہ پیدا ہو ہی گئی جو میرے خوابوں کی ملکہ ہے۔ وہ سب کچھ سمجھتی ہے۔ میں اس خیالی کلکٹر پر ہنس پڑا جو عرصہ سے میرا رقیب بنا ہوا تھا۔ میں نے بہت اچھا کیا جو عطیہ سے یہ نہ بتایا کہ میں اس کو بھول جاؤنگا میں خود اپنے آپ کو بھولا ہوا ہوں۔ بھلا اس کو کیسے بھول سکتا ہوں۔ یہ بالکل غلط بات ہے کہ کوئی کسی کو بھول سکتا ہے جس کو جتنا بھلاؤ۔ وہ اتنا ہی یاد آتا ہے۔ اور نئی بات یہ ہے کہ آج عطیہ مسکرائی ۔۔۔۔۔۔

اس زندگی کے اندھیرے میں اس کی مسکراہٹ کتنی نئی۔ کتنی امید افزا کتنی روشن تھی ــــــ اس کی اس مسکراہٹ نے مجھ میں زندہ رہنے کی توانائی پیدا کی ــــــ میں اور پسینہ بہا سکتا ہوں۔ ستر روپیوں میں تو بہت ہی کم چاندی ہوتی ہے۔

میں جب گھر پہنچا تو معلوم ہوا کہ شوکت حسین جو کلکٹر کچہری میں کلرک تھے اُن کی بیوی میری ماں سے ملنے آئی ہیں۔ مجھے بڑا تعجب تھا کہ انھوں نے آج اس غریب خانے کو کیسے نوازا۔ ہماری غریبی نے تو سارے محلے والوں سے رشتے ناتے توڑ رکھے تھے۔ اب تیس روپے کا اضافہ ہوتے ہی ہم کہاں کے امیر ہو گئے کہ میزبانی ہمیں زیب دے سکے۔

رات کے کوئی دس بجے جب شوکت حسین کی بیوی چلی گئیں تو میں نے دیکھا کہ مٹی کے تیل کی مدھم روشنی میں بھی میری ماں کا چہرہ نئی خوشی سے تمتما رہا ہے۔ جیسے شوکت حسین کی بیوی اس سے ملنے نہیں آئی تھی بلکہ اس کی کمر میں گدگدیاں کرنے آئی تھیں۔ میری ماں نے میری جھٹ پٹ بلائیں لے کر اپنے پوپلے منہ سے کہنا شروع کیا۔

"بیٹا ــــــ ابھی جو شوکت حسین کی بی بی آئی تھیں۔ وہ اپنے ساتھ اس گھر کا چراغ بھی لائی تھیں۔ وہ تمہارے لیے اپنی لڑکی زینت کا پیام لائی تھیں۔ لڑکی کو میں نے بارہا دیکھا ہے۔ گوری گوری رنگت۔ بڑی بڑی بادام جیسی

آنکھیں۔ سیدھی ناک۔ بیٹا لڑکی لاکھوں میں ایک ہے۔
اور شوکت حسین کی بی بی تو تمہارے اخلاق اور چال چلن
پر بچھی جاتی ہے۔ بھلا ایسے زمانے میں میرے لال ایسے
شریف لڑکے کہاں مل سکتے ہیں؟"

ماں کی چلتی زبان ایک کھوکھلی ہنسی میں تھم گئی۔ اس ہنسی میں خالی مسوڑھے نکلے پڑ رہے تھے۔ اور ادھر بجلی کی روشنی میں عطیہ کے منہ میں چمکتے ہوئے موتی۔ میں خاموش رہا۔ میرے پاس اپنا کوئی جواب نہیں تھا۔ میں عطیہ سے پوچھ لینا چاہتا تھا۔ اس کا جواب ہی میرا جواب ہو سکتا ہے۔

رات بھر میرے کانوں میں کھوکھلی ہنسی بجتی رہی اور خوابوں میں موتیوں کے ڈھیر جمع ہوتے گئے۔ میں کچھ بھی فیصلہ نہ کر سکا۔

سویرے ہی میں عطیہ کے گھر جانا چاہتا تھا۔ مگر خوشی سے بوکھلائی ہوئی بوڑھی ماں مجھ سے پہلے وہاں پہنچ گئی تھی۔ اور میں جیسے مر گیا تھا۔ اور اپنی روح سے پہلے آسمان پر پہنچ گیا تھا۔ سورج نکل آیا تھا۔ مگر میں چارپائی پر ہی لوٹتا رہا۔ اور بار بار میرا دل مجھ سے پوچھ رہا تھا۔ ستر روپے میں کتنی چاندی ہے اور کتنے شوکت حسین اس چاندی پر ریجھے ہوئے ہیں۔

اسی اثنا میں میری بوڑھی ماں واپس آ گئی۔ اور اپنے تھرتھراتے ہوئے ہاتھ سے ایک خط دیتے ہوئے کہا۔

بیٹا تیری خالہ نے یہ خوشخبری سن کر مجھے ناشتے

کے ساتھ مٹھائی بھی کھلائی۔ اور عطیہ نے بھی یہ
مبارکبادی کا خط دیا ہے۔"
میں نے مایوسی کی گہرائیوں میں گرتے ہوئے عطیہ کا خط پڑھا۔
"بھائی جان —— آپ کی شادی کی خبر سن کر مجھے بے حد
خوشی ہوئی۔ مگر ایک بات کہنے کی اجازت دیجیے کہ آپ کی
ہونے والی بیوی میری ایک پیاری سہیلی ہے۔ مگر رنگ ذرا
کالا ہے۔ اور جسم ذرا بے ہنگم۔ ناک موٹی ہے۔ مگر کچھ زیادہ
موٹی نہیں۔ اور سب ٹھیک ہے۔ میری دعا ہے کہ آپ
خوش اور خرم زندگی بسر کریں۔

آپ کی بہن :- عطیہ

میں نے وہ خط پھاڑ کر پھینک دیا۔ جیسے۔ اپنی دانست میں عطیہ کا
بھی خاتمہ کر دیا۔
اسی شام زینت کے ابا نے میری دعوت کی تھی۔ میں زینت کو
صرف ایک بار شادی سے پہلے دیکھ کر معلوم کرنا چاہتا تھا کہ میری قسمت
کیسی ہے زینت کی چھوٹی بہن اس تھوڑے سے عرصے میں مجھ سے اتنی
گھل مل گئی تھی کہ میں نے چپکے سے اس کو زینت کی ایک تصویر مانگ
لانے کے لئے کہا —— جب میں گھر واپس ہو رہا تھا تو دروازے
پر زینت کی چھوٹی بہن نے مجھے اس کی تصویر چھپا کر دے دی۔ اور میں
نے سڑک کے کنارے ایستادہ بجلی کے خاموش کھمبے کی روشنی کے پاس

پہنچ کر صبر و سکون سے اس تصویر میں اپنی قسمت دیکھی ـــــ ایک ہلکی پھلکی سی دبلی پتلی لانبی لڑکی ـــــ تیکھے خط و خال۔ دلآویز ناک نقشہ اور رنگت بھی صاف معلوم ہوتی تھی۔ اس میں ایک ہندوستانی ایکٹرس دیوی کا رانی سے بہت مشابہت تھی مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ ہندوستانی گھرانوں میں کیسی کیسی خوبصورتیاں چھپی ہوتی ہیں ـــــ! مگر یہ کیا عطیہ نے تو لکھا تھا کہ رہ کالی ہے۔ بے ہنگم ہے۔ ناک موٹی ہے عطیہ نے ایسا کیوں لکھا تھا۔ میں بجلی کے کھمبے کا سہارا لے کر سوچنے لگا۔

"کیوں ـــــ ایسا کیوں ـــــ آخر ایسا کیوں"

شادی کے دن تک تو میری زندگی ایسی گذرتی رہی جیسے کوئی کنواری لڑکی کسی خارزار سے گزر رہی ہے۔ اور قدم قدم پر اس کا دوپٹہ کانٹوں سے الجھ جاتا ہے۔

اور بالآخر وہ منور صبح آ گئی جب میرے گھر کے آگے باجوں نفیریوں ڈھول تاشے کا شور سن کر پچھلی شب کے تارے جگمگاتے مسکراتے آسمانوں کے اوپر خدائے قدوس کو یہ خوش خبری سنانے کے لئے چلے گئے عطیہ نہ سہی زینت ہی سہی۔ آج سے گھر کا اور زندگی کا اندھیرا تو دور ہو جائے گا۔ روح کا اندھیرا ابھی دور ہو جائے گا۔ زندگی کے بوسیدہ اوراق میں یہ کتنا سنہرا ورق لگ گیا ہے۔ آج تک مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ ایک پھول میں کتنی پنکھڑیاں ہوتی ہیں۔ آج سر سے پاؤں تک پھولوں میں لدا ہوا ہوں۔ ایک مدت تک گیلی نم زمین اور

لکڑیوں کے دھوئیں کی بو سونگھتے سونگھتے دفعتاً بیشمار گلاب اور چنبیلی کے پھولوں کی ملی جلی خوشبو میں سانس لے رہا ہوں۔

ماں نے میری پیشانی چوم کر میرے سہرا باندھا اور میں باہر نکلنے ہی والا تھا کہ عطیہ کی چھوٹی بہن آئی اور کہا کہ "بھیا ـــــ باجی تم سے کوئی ضروری بات کہنا چاہتی ہیں۔ وہ تمہارے کمرے میں تمہارا انتظار کر رہی ہیں۔"

میں کچھ سوچے بغیر اپنے کمرے کی طرف چلا۔ دروازے میں ہی عطیہ کھڑی تھی۔ گم سم جیسے کوئی مرمریں مجسمہ۔ اس کی آنکھیں ایسی پھٹ گئی تھیں جیسے اس کے بڑے بڑے دیدے باہر نکل پڑیں گے اس نے مجھے دیکھ کر مسکرانے کی کوشش کی مگر اس کے ہونٹ کانپ کر رہ گئے میں نے پوچھا۔

"عطیہ ـــــ تم نے مجھے بلایا تھا ـــــ؟"

"ہاں ـــــ نہیں نہیں۔ میں نے نہیں بلایا تھا۔ میں ۔ ۔ ۔ ۔!"

اور پھر وہ روتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

دودھ میں مکھی

جب سے بڑے بڑے پیسے والے انسانوں نے کرہ ارض آپس میں بانٹ لیا ہم جیسے ایک روپیہ روز کمانے والے انسانوں کے لئے اس وسیع و عریض دھرتی کا ایک چپہ بھی ایسا نہیں رہا جو ہمارا ہو۔ جو کچھ ہے وہ لالہ ہری داس کا ہے۔ اس کی چنتامنی بلڈنگ کے ایک بوسیدہ کمرے میں رہتا ہوں۔ مہینے کے مہینے تین روپے کرایہ ادا کرتا ہوں ——— میں اکیلا ہی نہیں بلکہ مجھ جیسے اور بہت سے ایک روپیہ روز کمانے والے انسان بھی وہاں تین روپیہ ماہوار کرایہ دے کر زمین پر زندہ رہتے ہیں۔ بمبئی یونیورسٹی کا بے روزگار نوجوان ہریش چندر بھی اور کمرشیل بنک کا بوڑھا کلرک گلاب چند اور اس کی نوجوان بیوی بسنتو بھی ——— اس چنتامنی بلڈنگ میں نہ کوئی بڑا ہے نہ کوئی چھوٹا ——— سب برابر برابر ہیں۔ سب ایک دوسرے کے دوست۔ سب ایک روپیہ روز کے لئے مر مر کر زندہ رہنے والے۔ اور مہینے کے مہینے عرق ریزی سے بنائے ہوئے تین سکے لالہ ہری داس کی خدمت میں پیش کر کے ایک مہینہ اور زمین پر زندہ رہنے کے حق کو محفوظ کر لیتے ہیں۔

میرے کمرے کے دائیں طرف کنوارا نوجوان ہریش چندر اور بائیں طرف بوڑھا کلرک گلاب چند اور اس کی نوجوان بیوی بسنتو رہتے رہتے ہیں۔ ہم لوگ تھک تھکا کر شام ہی سو جاتے ہیں۔ اور صبح چڑیوں کے چہچہانے سے قبل ہی جاگ پڑتے ہیں۔ صرف اتوار کی چھٹی کو ہم بھی "صاحبوں" کی طرح دس گیارہ بجے تک پیر پھیلا کر سوتے ہیں۔

مگر ایک اتوار ——— خلافِ معمول چڑیوں کے چہچہانے سے قبل اور گلاب چند کے بھجن گانے سے پہلے ہی مجھے جاگ اٹھنا پڑا میرے کمرے کے باہر بڑا شور ہو رہا تھا۔ ایک غصیلے بیل کی طرح بوڑھا گلاب چند پھنکارے بھر رہا تھا ——— برابر برابر حیثیت والے انسانوں کی پُر امن زندگی میں جھگڑا چنتا منی بلڈنگ کی تاریخ میں ایک نیا باب کھولتا تھا۔ میں نے دروازہ کھول کر دیکھا کہ نوجوان ہریش چندر ہاتھ میں لوٹا لئے سر جھکائے کھڑا ہے اور گلاب چند بار بار گر جانے والے جینو کو کان پر لٹکاتے ہوئے اس پر ساون کی جھڑی کی طرح برس رہا ہے۔ اور دس پانچ کرایہ دار جھگڑا چکانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

بات اتنی تھی کہ نوجوان بسنتو نل پر کپڑے دھو رہی تھی۔ ہریش چندر لوٹے میں پانی بھرنا چاہتا تھا۔ بسنتو وہاں سے ہٹ نہیں رہی تھی۔ اس لئے ہریش چندر نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور گلاب چند نے کھڑکی سے اشلوک پڑھتے ہوئے یہ سب کچھ دیکھ لیا۔

ہندوستانی عورت کا ہاتھ صرف ایک ہی مرد پکڑ سکتا ہے۔
مجھے ہریش چندر سے قطعی یہ اُمید نہیں تھی۔ اتنا فاقہ زدہ ہونے کے بعد بھی اس کے رگ پٹھے میں ایسا تناؤ کیسے پیدا ہو گیا۔ بالکل عجیب بات تھی میں نے بسنتو کی طرف دیکھا۔ وہ سر جھکائے ایک رحم طلب کرنے والے مجرم کی طرح اپنے بوڑھے شوہر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ مگر میں نے اس کی آنکھوں میں خاص جھلک بھی دیکھی —— اس جھلک کو الفاظ کا جامہ پہنایا جائے تو یوں ظاہر ہو۔

میرے بوڑھے قابلِ رحم شوہر —— کیوں اس دہکتے ہوئے نوجوان کے منہ لگتے ہو۔ یہ تو جیسے جوانی کی آگ سے پھنک رہا ہے۔ اور تم —— تمہیں دیکھ کر تو میرا من کہتا ہے

"سیاں توری سیجریا پہ میں نہ آؤں گی"

ممکن ہے میں نے غلط سمجھا ہو۔ کیونکہ بسنتو ایک جہت ہی شریف عورت مانی گئی ہے۔ جس کی شرافت ایک لمبے گھونگھٹ کی شکل میں ہمیشہ اس کے چہرے پر لہراتی ہے۔ میں نے ہریش چندر کی طرف ملامت بار نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا ——

ہریش چندر —— کیا یہ حرکت تمہیں زیبا ہے —— ؟ کیا تم نے سمجھ رکھا ہے کہ ان گندے کمروں میں رہنے والی عورتیں بھی گندی ہوتی ہیں اور کیا ان کرایہ کے

کمروں میں عورتیں بھی کرایہ کی ہوتی ہیں؟"

ہریش چندر نے گھبرا کر جواب

"مگر بھیا.........

گلاب چند بات کاٹتے ہوئے للکارا۔

بس ہمیں بھائی نہ کہو ـــــــ گنڈے ـ بدمعاش۔ اگر ایسی ہی جوانی اُبلتی ہے تو شادی کیوں نہیں کر لیتے ــــ؟

شادی ـــــــ! اب تو میں بھی چونک پڑا۔ ہم جیسے ایک روپیہ روز کمانے والوں کے لیے شادی کرنا ایسا ہی ہے۔ جیسے کسی مہارانی کو خواب میں دیکھ لینا۔ ہم شادی نہیں کر سکتے اسی لئے تو دوسروں کی عورتوں کو پیاسی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ اور جب ہمیں یہ خیال آتا ہے کہ ہماری زندگی میں شادی کا کوئی امکان ہی نہیں۔ تو ہماری امنگیں خطرناک حد تک ابل پڑتی ہیں۔ اس وقت ہریش چندر صرف ہریش چندر نہیں رہتا۔ بلکہ ایک مرد اور بسنتو گلاب چند کی بیوی نہیں رہتی بلکہ ایک عورت ـــــــ پیسے سے مجبور انسانوں کی یہی اخلاقیات ہوتی ہیں ـــــــ

مجھے اب ہریش چندر سے یکایک ہمدردی ہو گئی۔ میں نے اس کی طرفداری کرتے ہوئے کہا۔

"مگر بھتیا گلاب چند ـــــــ یہ اتفاق ہی کی تو بات ہے۔ ہو سکتا ہے کہ غلطی سے ہریش چند نے بھول کر

بسنتو کا ہاتھ پکڑ لیا ہو۔ اس نے ۔۔۔۔۔۔"

ہریش چندر نے مدد پا کر جرأت کی۔

"ہاں بھیا۔ بالکل غلطی سے بھول کر میں نے ۔۔۔۔۔

گلاب چند نے ہوا میں کانپتا ہوا ہاتھ نچا کر کہا۔

تم چپ رہو جی ۔۔۔"

میں نے کہا ——— "بھیا گلاب چند ——— ہریش کو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ اس قماش کا لڑکا نہیں ہے۔ اور اتنی سی بات کو خواہ مخواہ جھگڑے کی بات بنا دینا خود تمہاری بدنامی کا باعث ہے ——— اب چلو معاف کر دو۔ چلو ہریش۔ بھیا سے معافی چاہ لو ——— "

ہریش نے آگے بڑھ کر سر جھکا کے معافی چاہ لی۔ مگر گلاب چند بڑبڑاتا ہی رہا۔ اور میں نے اس کو زبردستی اس کے کمرے میں پہنچا دیا۔

اِدھر میرے دل میں کرید سی پیدا ہو رہی تھی کہ ہریش چندر سے پوچھنا چاہئیے کہ ہاتھ بھر لمبے گھونگٹ کو ہمیشہ دیکھتے رہنے کے باوجود اس کے ہاتھ میں اتنی طاقت کہاں سے آگئی ——— کوئی بات ضرور ہوگی میرا دل کہتا ہے کہ کوئی بات ضرور ہے۔

جب میں کوئیلے سے دانت مانجھتا ہوا نل کے قریب گیا۔ تو وہاں ہریش چندر بیٹھا منہ دھو رہا تھا۔ میں نے اس کے قریب کے

پتھر پر بیٹھتے ہوئے رازدارانہ انداز میں پوچھا۔

"ہریش ——— میں مانتا ہوں کہ بسنتو ایک بہت ہی شریف عورت ہے۔ مگر میرے دل میں جو کریدسی پیدا ہو رہی ہے وہ کیوں ——— ؟"

ہریش نے منہ میں بھرے پانی کی کلی کرتے ہوئے جواب دیا۔

"بھیا کنول ——— تم کیا جانتے ہو سسری کو اسی گھونگھٹ کو الٹ کر اس کے ماتھے پر لکھے ہوئے گناہوں کو پڑھو۔ تو تمھیں معلوم ہو گا کہ وہ سامنے اینٹوں کے بھٹے پر کام کرنے والی مزدورنیاں اتنی داغدار نہیں جتنی کہ یہ عورتیں جو گھونگھٹ کی آڑ میں سے جھانکتے ہوئے تمام جرائم چھپا لیتی ہیں۔"

"مگر بھیا ——— یہ سب تمھیں کیسے معلوم۔"

ہریش نے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا۔

"ہاں تو سنو ——— یہ نیچے کے کمرے میں جو کالا موٹا سا بڑھئی رہتا ہے نا۔ کیا نام ہے اس کا ——— گوبندو، کل وہ کہہ رہا تھا کہ جس دن اسے کام نہیں لگتا تو بسنتو اسے چوری چھپے اٹھنی چونی دے دیتی ہے۔ بھلا ایک شوہر والی عورت کو ایک غیر مرد سے ہمدردی کیوں ——— ؟ سوچنے والی بات ہے نا بھیا ——— ؟"

اٹھنی۔ چونی ——— ؟ وہ خود دیتی ہے ؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"اور نہیں تو کیا گلاب چند دے سکتا ہے۔ جب سے اس کو نیچے والے کمرے میں رہتے دیکھا ہے۔ شاید ہی کبھی کام پر جاتے دیکھا ہو کھاتا پیتا کیسے ہوگا۔ بالوں میں خوشبو کے تیل کہاں سے آتے ہوں گے سلک کی قمیصیں اور مرسرائز کی دھوتیاں کہاں سے پہنتا ہوگا۔ کوٹھری کے تین روپیہ کہاں سے دیتا ہوگا یہی تو بات تھی کہ اتنے عرصے یہاں رہنے اور ایک لمبے گھونگٹ کو ہمیشہ چہرے پر لہراتے دیکھ کر آج پہلی مرتبہ میرے تن بدن میں انگارے بھڑک اٹھے۔ اور میں . . . . آگے تو تم جانتے ہو۔ اب میں چلتا ہوں لله

ہریش کے چلے جانے کے بعد میں بڑی دیر تک دانت مانجھنا بھول گیا۔ البتہ میری انگلی خود بخود دانتوں کو گھس رہی تھی۔ اور میں اس وقت چونکا جب بسنتو نل پر پھر پانی کا گھڑا بھرنے آئی۔ اور ادھر ادھر دیکھ کر زمین پر کچھ ڈھونڈ ھنے لگی۔ آج میں نے بھی اس کو نئی نظروں سے دیکھا۔

"بسنتو بہن ———" میں کھانس پڑا۔ آج ردِ عمل کا ایک سیلاب میرے دل میں موجیں مار رہا تھا۔ آج پہلی مرتبہ میں اس کو بہن نہ کہہ سکا ——— "کیا ڈھونڈ رہی ہو"

"اٹھنی ڈھونڈھ رہی ہوں بھیا۔ یہیں نل پر کپڑے دھوتے

وقت بھول گئی تھی "

میں نے عمداً جھوٹ کہہ دیا۔

"ارے ——— ابھی ابھی وہ کالا موٹا سا بڑھئی گوئندد یہاں آیا تھا۔ شائد اس کی نظر پڑ گئی ہو ——— مجھے تو وہ آدمی کچھ بدمعاش معلوم ہوتا ہے۔

میں نے غور سے بسنتو کی طرف دیکھا۔ وہ ایک دم ٹھٹک کر رہ گئی تھی۔ اور اس کا منہ طمانچے کھائے ہوئے منہ کی طرح سُرخ ہو گیا تھا۔ بیچارہ بوڑھا گلاب چند دفتر کی میز پر صرف بسنتو کے لئے ہی جھکا نہیں رہتا بلکہ نادانستہ اس کو گوئندد کو بھی پالنا ہے۔ آج مجھے معلوم ہوا کہ بھوکی اور ترسی ہوئی عورتوں کا پیشہ صرف جسم بیچنا ہی نہیں۔ بلکہ جسم خریدنا بھی ہے۔

مجھ پر اس واقعہ کا بڑا اثر ہوا۔ عورت جیسے تاج محل کا مرمریں مزار ہے جس کے اندر سڑی گلی ہڈیوں کے سوا کچھ نہیں۔ بسنتو اب میری نظر میں ایک دوہری شخصیت تھی۔ یعنی بسنتو کا جسم گلاب چند کا تھا اور بسنتو کی روح گوئندد کی۔

اسی شام میں سینما دیکھنے کے لئے چلا گیا۔ مگر بسنتو تو سینما کی ایکٹرس سے زیادہ آگے نظر آنے لگی سینما دیکھ کر میں چینی ریستوران میں جا بیٹھا۔ میری نظروں کے آگے خوبصورت عورتیں اور ان کے شوہر تھے۔ مگر میرے دل میں جیسے کانٹے چبھے ہوئے تھے۔

رات کے کوئی دو بجے میں چنتامنی بلڈنگ پہنچا۔ اپنے کمرے کو جانے کے لیئے میں جب لکڑی کا زینہ طے کر رہا تھا میں نے دیکھا کہ زینے کے سائے میں کوئی چھپا بیٹھا ہے میں نے سوچا شاید یہ میرا وہمہ ہے ——— اور اپنے کمرے میں چلا آیا ——— میرا جی چاہتا تھا کہ آج عورت پر جتنا لکھ سکوں لکھوں۔ مگر لالٹین میں تیل نہ تھا۔ اسی لیئے ایک سگریٹ جلا کر دروازے کی دہلیز پر جا بیٹھا دھم سی چاندنی بام و در پر ——— ایک سپید اداسی اور خموشی ساری کائنات پر چھائی ہوئی تھی میں ہزاروں میل دور وطن میں چھوڑ آئی ہوئی کنیز فاطمہ کو چاند میں دیکھ رہا تھا۔

اچانک مجھے نیچے سے ایک ہلکی سی سیٹی اور کسی کے کھنکارنے کی دھیمی سی آواز آئی۔ جیسے کھنکارنے والے نے منہ پر ہاتھ رکھ لیا ہو۔

میں اٹھ کر نیچے دیکھنا ہی چاہتا تھا کہ گلاب چند کے کمرے کا دروازہ کھلا اور تھوڑی دیر تک کھلا ہی رہا۔ مگر اس میں سے کوئی نہیں نکلا میں وہیں بیٹھا رہا ——— مجھے شبہ ہونے لگا کہ یہ بسنتو ہی ہے کیوں کہ اگر گلاب چند ہوتا تو باہر آجاتا۔ یہ ہچکچاہٹ کیسی ——— پھر دروازہ بند ہو گیا۔

میں نے دروازے کی آڑلی اور ایک چالاک جاسوس کی طرح ٹکٹکی باندھے دیکھنے لگا۔

بیچارہ گلاب چند سو رہا ہو گا۔ اسی لیئے بسنتو کا دل جاگ اٹھا ہے اور وہ سیٹیوں کی آواز پر متوالی ناگن کی طرح مست ہو رہی ہے۔

تھوڑی دیر بعد پھر دروازہ کھلا اور میں نے دیکھا ـــــ بسنتو کا باہر جھانکتا ہوا چہرہ بھی دیکھا۔ اس وقت مجھے یک بیک خیال آیا کہ میں گوندو سے ہزار درجہ بہتر ہوں۔ گوندو سے زیادہ اچھی شکل ہے میری ملنے جلنے والوں میں میں زیادہ عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہوں۔ نوجوان ہوں۔ تندرست ہوں۔ سینے میں دل رکھتا ہوں۔ گوندو کی طرح جانور نہیں ہوں ـــــــ اسی لئے میں ایک دم باہر نکل آیا۔ مگر بسنتو نے پھٹ سے دروازہ بند کر لیا اور پھر بسنتو کے کمرے سے آوازیں آنے لگیں۔

"ناتھ ـــــ ذرا جاگو تو ـــــــ اٹھو۔ اٹھو"

"کیا ہے بسنتو ـــــــ ؟" یہ گلاب چند کی آواز تھی۔

"ناتھ ـــــ اب میرا یہاں گزر نہیں ہوگا۔ یہ جگہ شریفوں کی نہیں مجھے میرے میکہ بھیج دو"

"کیا ہوا بتاؤ تو ـــــ کیا پھر ہریش چند نے . . . "

"نہیں ـــــ ہریش نے نہیں۔ بلکہ میں ذرا سنڈاس تک جا رہی تھی کہ تمہارے ہمسائے کنول نے میرا ہاتھ پکڑ لیا ہوں ـــــ ہوں ـــــ مجھے میرے میکہ بھیج دو"

گلاب چند غصے سے بھڑک اٹھا۔

"بدمعاش۔ رذیل کمینے لوگ۔ میں ابھی کنول کا دماغ سیدھا کئے دیتا ہوں" دروازہ بڑی زور سے کھلا۔ اور گلاب چند گالیاں بکتا باہر نکلا۔

اس کے ہاتھ میں ایک لمبی سی لکڑی تھی اور ایک ہاتھ میں لالٹین ——
اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"کیوں بے کمینے اپنے آپ کو بڑا پارسا بتاتا ہے تو۔ اب کہاں گئی تیری پارسائی۔ اس لکڑی سے تیرا سر نہ پھاڑ دوں تو میرا نام گلاب نہیں"
اس کا شور سن کر سب کرایہ دار اپنے اپنے کمروں سے باہر نکل آئے اور نیچے کی منزل سے صرف اکیلا گوبِندو اوپر دوڑا دوڑا آیا۔ میں نے اپنے غصے کو سنبھالتے ہوئے پوچھا۔
"گلاب چند —— تمہارا یہ طریقہ ٹھیک نہیں ہے میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے جو گالیاں بک رہے ہو"
گلاب چند چیخنے لگا۔
"کیا بگاڑا ہے —— گنڈے۔ بدمعاش۔ میری عورت ذرا سنڈاس تک جا رہی تھی۔ تو تو نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا پھر کہتا ہے کیا بگاڑا ہے"
اے بھگوان میں نے تو خواب میں بھی بسنتو کا ہاتھ نہیں پکڑا مگر میں سمجھ گیا کہ بسنتو مجھ سے کا ہیکا انتقام لے رہی ہے میں نے نہایت اطمینان سے کہا۔
"گلاب چند۔ بھگوان گواہ ہے جو میں نے کبھی خواب میں بھی بسنتو بہن کا ہاتھ پکڑا ہو"

"اور کیا بسنتو جھوٹ کہتی ہے ——؟" گلاب چند نے میری قمیص کا کالر پکڑ کر پوچھا —— میں تیرا سر پھاڑ دوں گا۔ کُتّے۔ کمینے۔!"

سوائے ہریش کے سب کرایہ دار بھوکے کتّوں کی طرح مجھ پر بھونک رہے تھے گوئندو نے اپنی ابل آئی ہوئی لال لال آنکھوں سے دیکھتے ہوئے پُوچھا۔

"شریف جادیوں پر بُری نجر ڈالتے سرم نہیں آتی بابو۔ عورت کا ایسا ہی سوک ہے تو ایک اٹھنی کیوں نہیں کھرچ کرتے ——؟"

میں اس کا جواب دینا چاہتا تھا۔ مگر ہریش مجھے زبردستی اپنے کمرے میں گھسیٹ لے گیا —— باہر گلاب چند ایک زخمی کتے کی طرح چیخ رہا تھا۔

دوسرے دن جب گلاب چند ہمیشہ کے لئے چنتامنی بلڈنگ چھوڑ رہا تھا ہم سب نے دیکھا کہ گلاب چند کے پیچھے گوئند داس کا اسباب پیٹھ پر لادے زینے سے اتر رہا تھا اور اس کے پیچھے بسنتو تھی جس کے چہرے پر ایک لمبا گھونگٹ لہرا رہا تھا۔

——— ❁ ———

تکیے میں کانٹے

وہ چھٹی کا دن تھا۔ ہم کلرکوں کا گویا یومِ خود مختاری۔ اس لئے ہم سب کلرکوں نے مل کر طے کر لیا کہ یہ جشن خود مختاری آبادی سے دور کہیں جنگل میں منائیں۔ جہاں چرچراتی ہوئی میز کرسیاں۔ کاغذ کے عجیب سڑاند پھیلانے والے فائلوں کے گٹھے۔ کلکٹر صاحب کی ڈکاریں اور قرضخواہوں کی بک بک نہ سنائی دے ہمارے اس جشن خود مختاری کی رونق بڑھانے کے لئے گوپال نے اپنی نئی نویلی خوبصورت دُلھن کو بھی اپنے ساتھ لانے کا وعدہ کیا تھا۔

اسی لئے سویرے ہی نہا دھو کر میں ایک اچھا سا سوٹ پہن کر باہر نکلنے ہی والا تھا کہ کسی نے زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے درازمیں سے جھانک کر دیکھا اور میری آنکھوں کے آگے ستارے ناچنے لگے۔ یہ زمین کے خداؤں کا ایک فرشتہ تھا۔ سیٹھ دھنی رام کا نوکر مکان کا دو مہینے کا کرایہ وصول کرنے کھڑا تھا۔ نرم نرم قدموں سے واپس آکر میں نے اپنے آپ کو چارپائی پر گرا دیا۔ اور آنکھیں پھیلا کر اپنی ہنس مکھ بیوی کے کانوں میں جگمگاتے ہوئے آویزوں کو دیکھنے لگا۔ جیسے اس سے کہہ رہا ہوں کہ دیکھ —— کوئی باہر کھڑا تیرے یہ جگمگاتے

آویزے چھیننا چاہتا ہے۔ تو روئے گی تو نہیں ——؟

میری بیوی سب کچھ سمجھ گئی اور اب تو وہ ایسی باتیں سمجھ لینے میں کافی مشق کے بعد بڑی ماہر ہوگئی تھی۔ اس نے اپنی مہارت کا ثبوت اس طرح دیا۔

"گھر نہیں ہیں —— پھر کسی وقت آنا"

باہر سے وہ بڑبڑایا۔

"لو بھئی —— یہ بھی خوب —— چھٹی کے دن بھی گھر نہیں ہوتے اس گھر کی ٹکریں مارتے مارتے تو ناک میں دم آگیا ہے۔ اچھا بی بی تو کب تک لوٹیں گے"

میری بیوی نے جھنجلا کر جواب دیا۔

مجھے کیا پتہ —— کوئی کہہ کر تھوڑی گئے ہیں"

"اچھا تو چاہے جب آئیں۔ میں یہیں بیٹھ کر انتظار کرتا ہوں۔ بار بار کون چکر لگائے بابا —— ہونہہ"

اور وہ سامنے والے چبوترے پر اوکڑوں بیٹھ کر مونچھوں پر تاؤ دیتا ہوا گنگنانے لگا۔ میری بیوی کی آنکھوں نے میری آنکھوں سے پوچھا اب کیا ہوگا ——؟ مگر میری تو روح جیسے پہلے ہی پرواز کر گئی تھی....

دور ہرے بھرے جنگل میں گوپال کی نئی نویلی دلھن کی بڑی بڑی خوبصورت اور شرما جانے والی آنکھوں میں میرا انتظار ہوگا۔ چندر بار بار کسی اونچی چٹان پر چڑھ کر نیچے پگ ڈنڈیوں پر نظریں دوڑا رہا ہوگا۔ مگر جس شخص کو

صاف سیدھی اور بے خطر شاہراہوں پر چلنے میں ڈر لگتا ہو۔ وہ الجھی الجھی پگ ڈنڈیوں پر چلنے کی جرأت کیسے کر سکتا ہے۔ جوگندر سنگھ گنگنا رہا ہوگا۔ "وہ وعدہ ہی کیا جو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" اور ہماری محفل کے پیر جی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے وعظ کر رہے ہوں گے کہ مذاہب میں ایفائے عہد کے متعلق سخت احکام ہیں مگر وہ اس وقت کی باتیں کر رہے ہوں گے جب دنیا میں "بارٹر" کا طریقہ خرید و فروخت نافذ تھا۔ عمر کو زیتون کے تیل کی ضرورت ہوتی تو بکر کو گیارہ کھجوریں دے کر اس سے تیل لے لیتا۔ زید کو اپنی کمسن لڑکی کے لئے اونٹنی کے دودھ کی ضرورت ہوتی تو ابو طالب کو پاؤ سیر گیہوں دے کر دودھ لے لیتا

——— یہ پیسہ کہاں تھا اور یہ سیٹھ دھنی رام کی توند کہاں تھی مگر اب کیا کیا جائے۔ ہمارا جشنِ خود مختاری! جی چاہتا تھا کہ پر لگا کر اڑ جاؤں ——— کہاں ہیں وہ ہندوستانی جادو اور ٹوٹکے جن کے لئے ہندوستان بدنام ہے۔ کیا یہ سب کہانیوں میں ہی اپنی تاثیر دکھاتے ہیں۔ یا کسی غالب نے دل بہلانے کو اپنے من سے یہ سب کچھ گھڑ دیا ہے۔

بھلا ایک مجبور انسان ایسی خرافات سے اور زیادہ کیا سوچ سکتا ہے۔ بہتر ہے آج پارٹی میں جانے کا خیال ہی چھوڑ دوں۔ اسی تاریک مکان میں ہی یک نک کیوں نہ ہو جائے میری بیوی کے چہرے پر آج نئی بشاشت ہے۔ اس کے کپڑوں میں آج بھینی بھینی

خوشبو رچی ہوئی ہے وہ گوپال کی نئی نویلی دُلھن سے زیادہ نئی دکھائی دے رہی ہے۔

میں نے پھر دراز میں سے جھانک کر دیکھا۔

سیٹھ دھنی رام کا نوکر وہاں سے آہستہ آہستہ کھسکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میری جان میں جان آئی۔ اور میں دروازے کا رُخ کرنے ہی والا تھا کہ ایک آواز آئی۔

کیوں شامو بھیا ـــــــ کدھر منہ چھپا رہے ہو۔
اور وہ ہمارے تین روپلے کہاں ہیں جو اس دن
گلجار بائی کے کوٹھے پر لئے تھے۔ دو مہینہ ہو گیا بھیا۔
اب سیدھی طرح دیدو ـــــــ ہاں"

یہ دوسرا مسٹنڈا تھا۔ ملا قربان علی بزاز کا نوکر جس کو دیکھ کر سیٹھ دھنی رام کا نوکر راہِ فرار اختیار کر رہا تھا۔ یہ بھی میرے ہی پاس آیا تھا۔ پندرہ روپے ساڑھے سات آنے دینے تھے۔

سیٹھ دھنی رام کا نوکر اس کے آگے گڑگڑا رہا تھا۔

"بھیا ـــــــ آج ایک دن دیکھ لو۔ کل شام مل چکے سمجھو۔ راموں کی ماں ذرا میکہ گئی ہے نا ـــــــ ورنہ کوئی بات نہیں تھی"

میں نے سوچا ایک انسان دوسرے انسان کا کتنا محتاج ہے میں سیٹھ دھنی رام کے مکان کا محتاج ہوں۔ سیٹھ دھنی رام کرایے کے روپیوں کا محتاج ہے۔ قربان علی کو میرے روپیوں کی ضرورت ہے۔

مجھے قربان علی کے کپڑے کی ضرورت ہے شاموگنگادین کا محتاج ہے۔ گنگادین گلجار بائی کا محتاج ہے ——— جب ایک دوسرے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے تو پھر آپس میں پھوٹ کیسی۔ انتشار کیسا ———

اماں ——— صاحب گھر ہیں؟"

میری بیوی جز بز ہو کر اٹھی اور چیخ کر بولی۔

"کہہ تو دیا ——— سویرے ہی باہر گئے ہیں۔ پھر کھڑے چیخ رہے ہو؟"

اچھا بی بی ——— خفا کیوں ہوتی ہو شام کو آجاؤں گا۔ گنگادین نے دبی دبی آواز میں کہا۔

حیرت ہے ابھی ابھی یہ مسٹنڈا ایک دوسرے مسٹنڈے کے آگے کھڑا مونچھوں پر تاؤ دے رہا تھا۔ صرف ایک نسوانی آواز سن کر کتنا موم ہو گیا واقعی عورت بڑے کام کی چیز ہے۔ ایسے ایسے معرکے جو طاقتور سے طاقتور مرد بھی فیصل نہ کر سکتے ہوں۔ عورت کی آواز کے جادو سے طے پا جاتے ہیں دنیا میں بڑے بڑے انسانوں میں جو لڑائیاں ہو رہی ہیں۔ اس کے تصفیے کے لئے بھی . . . . . .

گوپال کی نئی نویلی خوبصورت دلھن۔

اس کی یاد آتے ہی میں اچھل پڑا۔ اب راستہ بے خطر تھا۔ سائیکل سنبھالی اور رہوا ہو گیا۔

بارہ بج رہے تھے۔ درختوں کے سائے اپنے تنوں سے چمٹے

کھڑے تھے۔ ہلکی ہلکی سی گرم لوئیں چل رہی تھیں۔ پہاڑی پر سورج کا سارا سونا پگھل پگھل کر پھیل گیا تھا۔ دھرتی پر ایک غنودگی سکون اور سناٹا چھایا ہوا تھا۔ حیدر، جوگندر سنگھ۔ پیرجی۔ گوپال اور اس کی دُھن جھوٹی پیٹیوں۔ کیلوں اور نارنگی کے چھلکوں کے قریب ایک بوڑھے نیم کے سائے میں دری پر آڑے ٹیڑھے لیٹے سگار کے مطمئن خاموش اور آہستہ آہستہ بہنے والے دھوئیں کے بادلوں میں نہ جانے کس کس کو دیکھ رہے تھے۔ کس کس کو یاد کر رہے تھے اور کیا کیا سوچ رہے تھے۔

میں نے اپنی سائیکل ایک پیڑ سے لگا کر کھڑی کر دی۔ سب نے میری طرف سر اُٹھائے دیکھا۔ مگر سب کے پیٹ اتنے بھرے ہوئے تھے کہ کسی نے مجھے خوش آمدید کہنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ مجھے غصہ آ گیا۔ لیکن اپنا پیٹ بھر لینے کے بعد پھر دوسروں کی اتنی پروا کہاں ہوتی ہے۔ میں نے اپنا غصہ اپنے کوٹ کی جیب میں رکھا۔ اور نہایت بے تکلفی سے ٹفن کیریر کھول کر بچا کھچا کھانا شروع کیا۔ پیرجی نے مستی بھرے لہجے میں پوچھا۔

کہاں رہے یار اب تک ——— کیا بیوی نے اپنی موباف سے تمھارے پاؤں باندھ رکھے تھے "

اس جملے پر سب کو زور زور سے ہنس پڑنا چاہیئے تھا۔ مگر ایک طرح کے خمار کے زیر اثر صرف ہلکی ہلکی مسکراہٹوں سے وہ میری پسینہ سے بھیگی ہوئی پیشانی کی شکنیں دیکھنے لگے۔

گوپال نے پوچھا۔

"بتاؤ یار ——— آج شہر کی کیا حالت ہے۔ ہم تو سویرے ہی اُس پر شور دنیا سے بھاگ کر اس ویران پہاڑی پر پناہ گزیں ہیں۔"

میں نے فروٹ کریم کا ایک بھرپور چمچہ منہ میں انڈیلتے ہوئے جواب دیا۔ "لائق ستائش ہو تم لوگ۔ جو گھریلو تفکرات اور ایک دوسرے کا پیچھا کرنے والے انسانوں سے دور۔ پاپی۔ فریبی اور مکار دنیا سے بھاگ کر یہاں پناہ گزیں ہو۔ یہاں کسی کا ڈر نہیں۔ اگر میرے جسم میں پیٹ نہ لگا ہوتا۔ تو سنیاسیوں اور مہاتماؤں کی طرح میں ساری زندگی اسی بہشت میں گزار دیتا۔"

"ہیر ہیر ——— ہیر ہیر۔ خوب بولتے ہو۔"

پیر جی نے اوندھے لیٹتے ہوئے تالی بجائی۔ سب ہنسنے لگے۔ اور میں نے اپنی جھوٹی پلیٹیں دوسری جھوٹی پلیٹوں میں ملا دیں۔ اور سگریٹ سلگاتے حیدر کے قریب لیٹتے ہوئے سوچا۔

کتنا سکون ہے یہاں۔ کیسی شانتی ہے امن اور خاموشی یہاں نہ سیٹھ دھنی رام ہے نہ ملا قربان علی۔ مزے سے سگریٹ پئے جاؤ اور جئے جاؤ۔ ایسے ایسے مقامات پر صرف چالیس برس جینے والے سو سو برس تک جی سکتے ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ انسان کی عمر کا اوسط گھٹ گیا ہے گندے

گندے شہروں سے اُٹھ کر اور انسانی کھالوں میں چھپے
ہوئے درندوں سے بھاگ کر ایسی پرسکون پہاڑیوں پر
آبسو جہاں تمہاری داڑھیوں کو دیکھ کر حضرت خضر بھی شرما جائیں۔
ہم شام تک جنت میں لوٹتے رہے۔

پانچ بجتے بجتے جب ڈوبنے والے سورج کی پیلی پیلی دھوپ ہمارے چہروں پر کھیلنے لگی تو خمار اترا۔ ہری نیلی پیلی چڑیاں اپنے اپنے گھونسلوں کے سکون میں جارہی تھیں ——— کام کے بعد آرام کتنا میٹھا ہوتا ہے۔ روز کی تھکا دینے والی مصروفیتوں کے بعد چھٹی کا دن کتنا سہانا ہوتا ہے۔ اگر اس دنیا میں سیٹھ دھنی رام اور ملا قربان کی توند نہ ہوتی ———

جوگندر سنگھ نے گوپال کی نئی نویلی دلھن کی طرف پرشوق نظروں سے دیکھتے ہوئے اور دور ایک چوٹی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"کملا بہن ——— آؤ اس اچھے سے بیک گراؤنڈ میں تمہاری ایک تصویر کھینچیں۔"

گوپال نے کملا کو اجازت دے دی۔ اس کے بعد تاش کے متوالے گوپال نے کہا۔

"آؤ یار ——— جب تک تاش کھیلیں۔"

میں نے کہا۔

"کیا واہیات بات ہے۔ ایسا سماں دل پر ایک کیفیت طاری کر دیتا ہے۔ آؤ نظارہ کریں۔"

حیدر نے جواب دیا۔

"نہیں یار نظّارہ وظّارہ فضول ہے۔ کل سے پھر دفتر کی قید ہے چھٹی کے دن روز تھوڑی آتے ہیں۔ بس تاش اڑے گی"

پیر جی نے تائید کی۔

"ٹھیک کہتے ہو حیدر ——— تاش واقعی تاش"

میں نے پھر سوچا۔ ٹھیک ہے۔ خالی نظارے سے بھی کیا حاصل ہے۔ ہماری چشم بصیرت تو اندھی ہے۔ اب کوئی دوسرا مشغلہ ہو۔ کوئی کام جو بغیر کسی خوف اور ڈر کے کیا جائے بہترین ہے۔ تاش ہی سہی بے کھٹکے کھیلیں گے۔ آج ہی تو ہر طرف سے بے فکر ہونے کا موقعہ ملا ہے ——— تاش اڑنے لگی۔

پانچ سے چھ بج گئے۔ مگر جوگندر سنگھ اور گوپال کی نئی نویلی دلھن واپس نہ لوٹے۔ گوپال پریشان ہوگیا۔ کیا ایسی پرسکون جگہ پر بھی خطرے کا امکان ہے۔ کیا دنیا میں کوئی جگہ بھی محفوظ نہیں۔ جہاں انسان فراغت اور آسودگی کے سانس لے سکیں۔ ہم ان کی تلاش میں ادھر ادھر آوازیں لگانے لگے۔

اور پھر جب تیرھویں رات کا چاند آسمان پر مسکرانے لگا تو نیچے جہاں حیدر کے ایک رئیس دوست کی مانگی ہوئی کار کھڑی تھی۔ جوگندر کی آواز آئی۔

"گوپال بھیّا ——— ہم نیچے کار کے پاس تمہارا انتظار

کر رہے ہیں۔ راستہ بھول گئے تھے۔ تم اسباب لے کر نیچے آجاؤ!"
میں چونک پڑا۔ راستہ بھول گئے تھے۔ کیا یہاں بھی ہمارے شہر دہلی کی سی بھول بھلیاں ہیں۔ ہم اسباب لے کر نیچے اترے۔ کار کی اگلی سیٹ پر جوگندر سنگھ اور گوپال کی نئی نویلی دلھن ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ مجھے اس وقت ایک وسوسہ ستا رہا تھا۔ اپنی سائیکل کار کے پیچھے باندھ کر میں جوگندر سنگھ سے خواہ مخواہ ہی ماچس مانگنے گیا۔ حالانکہ ماچس میری اپنی جیب میں بھی تھی۔ اور غور سے گوپال کی دُلھن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ چاند کی چمکدار روشنی میں اس کی آنکھوں کو اور زیادہ چمکدار ہو جانا چاہیئے تھا۔ میں نے سگریٹ جلانے کے بہانے ماچس جلائی اور اس کی آنکھوں کو دیکھا ——— اس کی آنکھیں جیسے کسی تازہ گناہ سے دھندلی ہو رہی تھیں۔

وہ واقعی راستہ بھول گئی تھی۔

اور پھر اونچی نیچی ناہموار سڑک پر ہماری کار دوڑ رہی تھی جیسے زندگی

رذیل

کیا تم امریکی سرمایہ دار ہو ؟

کیا تم آریائی نسل سے ہو ؟

کیا تم نازی سپاہی ہو ؟

کیا تم روس کے نئے انسان ہو ؟

کیا تمھاری رنگت انگریزوں جیسی ہے ؟

تو شاید تم یہودی ہو ——— یا پھر چاکلیٹی رنگ والے ہندوستانی۔ بھاگ جاؤ یہاں سے۔ یہ انسانوں کی دُنیا ہے۔ یہاں تمھارا کیا کام ——— ؟

میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ کیسا عجیب خواب اور کیسی ستم ظریفی۔ ابھی تو میری عمر کا اکیسواں برس شروع ہوا ہے۔ میں تو گھنگریاں زلفوں کاجل بنا کالی آنکھوں۔ بھولی بھالی سُرخ سفید اور صندلی عورتوں رنگ برنگ کی ساڑیوں اور ستارے ٹنکے ہوئے جمپروں کے خواب دیکھنا چاہتا ہوں۔ مگر یہ خواب ...... ؟

میں نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ اگر کوئی میرا یہ قہقہہ سنتا تو ضرور گھبرا جاتا اور پوچھتا ——— تم ایسے ڈراؤنے قہقہے کیوں لگاتے ہو۔

بیمار تو نہیں ہو ——؟
ہاں میں بیمار ہوں۔ ایک اُجلی سی عالی شان کوٹھی اور ایک چمکیلی کار میں بیٹھنے والی گوری سی لمبی لڑکی کا بیمار ہوں۔ اسے صرف چند بار دیکھا ہے اور ہمیشہ کے لئے اس کو اپنی آنکھوں میں محفوظ کر لیا ہے۔ اپنے سینوں میں مقید کر لیا ہے۔ مگر یہ سراسر بیوقوفی ہے۔ میں کرائے کے ایک تنگ سے کمرے میں رہتا ہوں۔ نوکری ڈھونڈھنے لاہور آیا ہوں۔ اور وہ پھولوں پر بیٹھنے والی خوش رنگ تیتری اور میں ایک پتہ —— خشک۔ زرد۔ مرجھایا ہوا۔ مگر جب تصور میں ننگ دھڑنگ آوارہ اور خبطی قبیس کو امیر لڑکی لیلی کی آغوشِ محبت میں دیکھتا ہوں تو میرا خون بھی کھولنے لگتا ہے۔ اور اس لڑکی کو میں اپنے سے اتنا قریب دیکھتا ہوں کہ اس کی گرم اور اچھی سی بھینی بھینی خوشبو میں ملی ہوئی سانس میرے چہرے سے ٹکراتی ہے۔ . . . .

"چٹھی لے جائیے صاحب" باہر سے ڈاکئے نے آواز دی۔ یہ میری بوڑھی ماں کا خط تھا۔ خط پڑھ کر میں نے جھنجلا کر اپنے سر کے بال نوچ لئے —— وہ لکھتی ہے۔

"بیٹا —— اب کی رمضان کی عید میں گاؤں ضرور آنا میں نے نصیبن کی لڑکی شبو سے بات پکی کر لی ہے۔ چاندی کے کڑے اور پازیب بھی تیار کر لئے ہیں۔ لڑکی اچھے ناک نقشے کی ہے۔ صرف ذرا سانولی ہے ——"

میری ماں بھی کتنا اچھا مذاق کرتی ہے۔ صرف ذرا سانولی۔ کتنا

لطیف طنز ہے یہ۔ یعنی چاکلیٹی رنگ والی ——— اگر اس کو نصیبن کی لڑکی شبو ہی سے شادی کرانی تھی تو بی۔اے تک کیوں تعلیم دلائی۔ محبت کے فلسفوں سے کیوں روشناس کر دیا ——— کالج میں پڑھا کر مجھے آکاش پر کیوں بٹھا دیا۔

میں نے سرہانے تکیئے کے نیچے سے دو تین سفید کاغذ نکالے اور اپنی ماں کے مذاق کا جواب لکھنے لگا۔

پیاری ماں ——— نصیبن کی لڑکی شبو صرف ذرا سانولی ہے۔ سانولے پن سے کیا ہوتا ہے۔ اور اس میں شبو کا بھی کوئی قصور نہیں۔ مگر اس کا بیاہ گاؤں کے کسی چرواہے سے کر دو۔ اور وہ چاندی کے کڑے اور پازیب میری طرف سے اس کو تحفہ میں دیدینا۔ وہ اسی کے ساتھ خوش رہ سکیگی وہ دل کی دھڑکنیں سننے کے بجائے دیوار پر اُپلے تھاپے گی۔ چاندنی راتوں میں میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر باتیں کرنے کے بجائے نیند کے بھاری خراٹے لے گی۔ اور پھر ہر دوسرے تیسرے دن تم سے ایسا لڑا کرے گی کہ ساری پڑوسنوں کی موجودگی میں تمھارے سفید چونڈے کا ایک ایک بال ——— اسی لئے بہتر یہی ہے کہ اس کا بیاہ کسی چرواہے سے کر دو۔ جب وہ رات گئے باہر چوپال میں بیٹھ کر بانسری بجائے گا۔ تو تمھاری شبو اس کی ناک پکڑ کر اسے گھر لائے گی۔

اور ہمارے دیہاتی دم بخود اپنی اپنی گھر والیوں کو یاد کریں گے ——— ماں مجھے معاف ہی کر دو۔ میری ناک ذرا لمبی ہے میں چھینکتا بھی ہوں تو کارل مارکس

اور لینین کا نام لے لیتا ہوں گھبراؤ نہیں۔ یہ کارل مارکس اور لینین شہر کی خوبصورت لڑکیاں نہیں ہیں۔ بلکہ ۔ ۔ ۔

معاً مجھے خیال آیا کہ میں یہ خط کس کو لکھ رہا ہوں میری ماں تو ہندوستان کی عام جاہل ماؤں کی طرح بس ایک دیوانی ہی تو ہے۔ جس کو صرف مرنے سے پہلے اپنے لاڈلے کے سر سہرا بندھا دیکھنے کی آرزو ہے۔ چاہے اس کی بہو کا میکہ ابھی بینا ہی کیوں نہ ہو۔

میں نے وہ خط پھاڑ کر پرزے پرزے کر ڈالا اور ہوا کے ایک بگولے کے سپرد کر دیا کہ لے جائے وہ ان پرزوں کو میری ماں کے گاؤں، تاکہ میری بوڑھی ماں نصیبن، اور اس کی صرف ذرا سا نولی شبو دیکھ لیں کہ یہی میرا جواب ہے۔

شہر کے ایک اونچے سے ٹاور پر لگی ہوئی گھڑیال نے دس بجائے اور میں چونک پڑا۔ یہ کلاک ٹاور شہر کی سربلندی کی نشانی ہے۔ دن اور رات گھنٹے بجا بجا کر دن کو رات کی کینچلی پہنا دیتا ہے اور پھر دوسرے دن اتار لیتا ہے —— ایک دن اور ایک رات —— دوسرا دن دوسری رات مگر کبھی ایسا بھی کوئی وقت آنے والا ہے جب کہ نہ دن ہو اور نہ رات نہ میں نوکری ڈھونڈوں اور نہ وہ امیر لڑکی کھڑکی میں کھڑی ہو کر بڑبڑائے کہ

"میں ایک امیر لڑکی ہوں۔

اور ایک امیر لڑکے سے ہی شادی کروں گی۔

جس کے پاس اجلی سپید کوٹھی ہو اور ایک چمکیلی موٹر۔
میرا خوبصورت شوہر جب اس چاکلیٹی رنگ والے لڑکے کو
میری طرف گھورتا ہوا دیکھے گا تو اسے ہلاک کر دے گا
اور پھر خواب میں
خواب میں اس مفلس لڑکے کی پیلی پیلی ڈراؤنی آنکھیں مجھے نہیں ڈرائیں گی اور اطمینان سے چین سے میں اپنے ریشمی لباس میں ملبوس محبوب کے سینے سے چمٹ جاؤں گی۔"
ہونہہ ——— یہ لڑکی یہ سمجھتی ہے کہ میں ابھی زندہ ہوں اور اس کا شوہر مجھے مار ڈالے گا ——— ان ریشمی لباس والوں نے ہمیں پہلے ہی مار ڈالا ہے۔ اگر ہمارے سینے میں سانس چلتی ہے تو ہمیں زندہ نہ سمجھنا چاہیئے۔ یہ صرف سانس کی دھونکنی ہے۔ ہم چلتے پھرتے ہیں تو زندہ رہنے کے لیے نہیں بلکہ دھرتی پر اپنی قبریں ڈھونڈھنے کے لئے ——— تیرا شوہر مجھے ہلاک کر دے گا۔ یعنی مرے کو ماریں شاہ مدار۔ تیرا شوہر بھی شاہ مدار ہے کیا؟ دنیا میں بادشاہی صرف اسی لئے جلوہ گر ہوئی تھی۔ اپنے شوہر سے پوچھ کر مجھے ضرور بتانا لڑکی۔
ارے ——— قطب کے قہقہے نے مجھے جگا دیا۔ میں کھسیانا پڑ گیا مگر مجھے کھسیانا ہونے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ قطب بھی مجھ جیسا ایک انسان ہے ایک مشہور یونیورسٹی کا گریجویٹ۔ وہ بھی نوکری ڈھونڈھنے لاہور آیا ہے کیا وہ ایسا نہیں سوچا کرتا ہے۔ وہ تو اکیلے بیٹھا ہوا میں ہاتھوں کو نچا نچا کر

زور زور سے بڑبڑاتا بھی ہوگا ـــــ انسان ـــــ اشتراکیت ـــــ مساوات اور بہت سی جھوٹی جھوٹی باتیں۔

ہم دونوں نوکری ڈھونڈنے چلے۔

ایک اونچے سے ہوادار کمرے میں کاغذوں۔ لیجروں۔ فائلوں سے بھری ہوئی لانبی میز کے پاس ایک گدی دار گھومنے والی کرسی پر ایک گورا چٹا سا لمبا انسان بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا۔ میں اور قطب مسکین جانوروں کی طرح سر جھکائے کھڑے تھے۔ کھڑے کھڑے جب ہماری کمزور ٹانگیں دکھنے لگیں۔ تو صاحب ہم سے مخاطب ہوئے۔

"ویل ـــــ تم نے کہاں تک تعلیم حاصل کی"

میں نے جواب دیا۔

بی۔اے تک ـــــ اس کے بعد میرا باپ لڑائی میں مارا گیا۔ میری ماں کو گیارہ روپیہ پنشن مل گئی۔ میں آگے تعلیم جاری رکھنا چاہتا تھا مگر یونیورسٹی کا آہنی پھاٹک میرے آگے بند تھا۔ اب پیٹ کے فاقوں سے مجبور آپ کے پاس آیا ہوں۔ اُمید کہ آپ......

صاحب نے بے پروائی سے قطب کی طرف دیکھتے ہوئے میری زبان روک لی۔

اور تم کہاں تک پڑھے ہو؟"

صاحب میں بھی گریجویٹ ہوں۔ پچھلی وبا میں میرے والدین اللہ کو پیارے ہو گئے اور میں زندگی کے اندھیرے میں بھٹکتا لاہور آیا

یہاں ہر ایک کے آگے ہاتھ پھیلائے ــــــ نوکری ــــــ نوکری ــــــ نوکری۔ مگر بھاگ نہ کھلے۔ آپ کی نیک نامی کا شہرہ سن کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ مجھ سے جو خدمت بھی لیجئے میں تیار ہوں"

مجھے غصہ آگیا ــــــ جھوٹا ــــــ مکار۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ قطب کے ماں باپ دونوں زندہ ہیں۔ اور اب بھی جالندھر شہر کے باہر سوکھی اکھڑ دری زمین میں ہل چلا رہے ہیں۔ ادنیٰ سی نوکری کے لئے اتنا بڑا جھوٹ ــــــ ایسا بڑا گناہ۔

واہ رے اللہ میاں کے خلیفہ ــــــ!

صاحب نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"مسٹر ــــــ تمہارے دوست کی داستان تمہاری داستان سے زیادہ غمناک ہے۔ آپ کی والدہ کو سرکار سے پنشن تو ملتی ہے۔ یہ بیچارہ تو واقعی قابل رحم ہے"

قابل رحم ــــــ میں نے حقارت بھری نظروں سے قطب کی طرف دیکھا۔ اور فوراً ہی صاحب کی میز پر اپنے پروفیسروں کے سرٹیفکٹ رکھ دیے اور کہنا شروع کیا۔

"صاحب میں تو اس سے بھی زیادہ قابل رحم ہوں۔ ہماری یونیورسٹی کے بڑے بڑے پروفیسروں کے پروانے پڑھیئے کہ انھوں نے کن الفاظ میں میری قابلیت۔ مستعدی اور اخلاق کی تعریفیں فرمائی ہیں۔

صاحب نے بیزاری سے جواب دیا۔

مگر ہمارا کام انصاف ہے۔ حق بحقدار رسید۔"

میں نے اپنی قابلیت۔ مستعدی اور اخلاق کے پروانے میز پر سے اٹھالئے۔ کیا فائدہ ان لمبے لمبے پروانوں سے جب کہ وہ ایک معمولی سے جھوٹ کے آگے ہیچ ہیں۔

میں نے باہر نکل کر سوچنا شروع کیا۔ سانچ کو آنچ لگ گئی ہے۔ اس دنیا میں زندگی کی زلف سر ہونے تک وہی جی سکتا ہے جو جھوٹ بول سکتا ہے اب تو میں بھی جھوٹ بولا کروں گا۔ نت نئے جھوٹ۔ میری بوڑھی ماں نے آج سے دس سال پہلے گاؤں سے نکلتے وقت ایک قرآن شریف ایک مصلیٰ دیتے ہوئے نصیحت کی تھی کہ ہمیشہ راست بازی سے کام لو۔ خدا خوش ہوتا ہے اور عاقبت میں جنت کی ایک عالی شان کوٹھڑی رہنے کو ملتی ہے۔ مگر کہاں ہے خدا اور کدھر ہے وہ جنت۔ جب چھوٹے خدا راستبازی سے خوش نہیں تو بڑے خدا سے کیا امید؟ میری سادہ لوح ماں ——— اس دنیا میں وہی جیت سکتا ہے۔ جس کی زبان چکنی ہے۔ رہا دوزخ ——— دوزخ سے کون ڈرتا ہے۔ دوزخ اس دھرتی سے کچھ اچھا ہی ہوگا۔ خدا۔ جنت۔ دوزخ ——— یہ بڑے خوش آیند تخیلات! میں اب تخیلات کے فریب میں نہیں آسکتا۔ میں پرچھائیں کو پکڑنے کی کوشش نہیں کرتا ——— حضرت محمدؐ نے کیا کہا تھا یسوع مسیحؑ کی کیا تعلیم تھی کچھ معلوم نہیں۔ قرآن اور بائبل الماریوں میں بند ہیں یسوع مسیحؑ اگر

پھانسی پر چڑھا دیا گیا ہے۔ قطب جھوٹ بول رہا ہے۔ صاحب انصاف کر رہے ہیں۔

سڑک پر سے ایک خوبصورت ایکٹرس موٹر چلاتی گذر گئی۔ کالج کی کنواریاں آپس میں باتیں کرنے لگیں۔

"اس کی تنخواہ تین ہزار ہے۔"

"نہیں چار ہزار۔"

"پانچ ہزار"

میں نے دل ہی دل میں کہا۔ تمہاری قیمت بھی پانچ ہزار ہوسکتی ہے اسی زمین میں جہاں گوتم بدھ۔ بھیم۔ ارجن۔ نور جہاں۔ ٹیگور اور اقبال کو دفن کر دیا گیا۔ اسی زمین پر کانن بالا۔ نسیم۔ ممتاز شانتی اور منورما ابھر آئے ہیں۔

سامنے سے ایک برات دھوم دھام سے آرہی تھی۔ لوگ زرق برق لباس پہنے۔ انگریزی باجوں کے نغمے چمکتی ہوئی موٹریں۔ گلاب چمبیلی اور زعفران کی فضا میں رچی ہوئی خوشبو۔ اور وہ کھلے ٹاپ والی موٹر میں پھولوں میں لدے پھندے دولھا۔ دولھن۔ میں نے اپنی سانس کو روک کر دولھن کو دیکھا —— وہی اجلی سپید کوٹھی میں رہنے والی اور چمکیلی موٹر میں بیٹھنے والی سندر ناری میں نے اپنے دل سے کہا۔

سچ ہے —— ناری نے سچ کہا تھا۔

اور پھر میرا سر ایک شکست خوردہ انسان کی طرح میرے سینہ پر

جھک گیا امیر لڑکی ایک امیر لڑکے ہی سے شادی کر سکتی ہے ——

اس وقت چند بے تحاشہ قہقہوں نے میری گردن پھر اوپر اٹھادی۔ ایک موٹر میں تین طوائفیں بیٹھی تھیں لال لال ساڑھیاں۔ ہونٹوں پر لاکھا اور مسّی۔ گالوں پر پاؤڈر اور گلابی خون کی روئیں اگلی سیٹ پر ایک میاں جی بیٹھے تھے۔ جو پیچھے مڑ مڑ کر طوائفوں کو اپنی استادی کے گُن بتا رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں کاجل لگا تھا۔ سر پر ایک رامپوری دوپلی جسم پر ململ کا انگرکھا —— اور ہونٹ پان کی پیک سے رنگے۔

معاً مجھے خیال آیا کہ اس زمین پر زندہ رہنا بہت آسان ہے۔ کالی سُرخ اور خاکی قمیص کے بجائے صرف ململ کا ایک انگرکھا درکار ہے۔ نہ سرمایہ داری کی ضرورت ہے۔ نہ آریائی خون کی۔ نہ نازیت کی اور نہ انگریزوں کی رنگت کی۔ . . . میں آج ہی اپنی ماں کو خط لکھ دوں گا کہ مجھے نصیبن کی لڑکی سے بیاہ منظور ہے۔ نصیبن کی لڑکی شبو اور شبو کی طرح دوسری جوان لڑکیاں۔

میں نے ایک نئی مسرت سے ایک طوائف کو دیکھا جو اپنے ہونٹوں پر لاکھا لگاتے ہوئے ریچھ کے آئینے میں اپنے آپ پر مسکرا رہی تھی۔

مجھے یقین ہے کہ کل دُنیا مجھے رذیل کہے گی ——

سیاست

کل میں نے منع کر دیا تھا۔ مگر آج پھر وہ میرے پیر چھو کر پاؤں دابنے لگی۔ کتنی عجیب عورت ہے۔ ازدواجی حیثیت سے ہم دونوں میں اتنی جسمانی اور مرئی قربت ہے۔ لیکن پھر بھی وہ مجھ سے بہت دور ہے۔ اتنی دور جتنی کہ دہلی ماسکو سے دور ہے۔ فاصلے کے علاوہ زندگی کی دوڑ میں بھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اس کے ماں باپ نے اس کو صرف یہ بتایا ہے کہ شوہر مجازی خُدا ہوتا ہے۔ اسی لئے وہ مجھے پتی دیوتا کہتی ہے ——— یعنی بالکل انجان طریقے پر وہ میرا مذاق اڑا رہی ہے بلکہ بڑی چبھتی ہوئی گالی دے رہی ہے بھلا میں اور دیوتا ——— ؟ مجھے اپنی بھولی بھالی معصوم بیوی کے اس اَن جانے بوجھے مذاق ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ گالی پر ہنسی آجاتی ہے۔ میں اس سے کہنا چاہتا ہوں کہ تو مجھے یوں گالی دیتی رہی اور میں یونہی جھینپ جھینپ کر مسکراتا رہوں ——— مگر وہ تو سو گئی۔ پلنگ کی پائنتی وہ میرے پیر داہتے داہتے تھک کر انہی پر سر رکھے خراٹے لینے لگی! مجھے اپنی عورت کی اس گراں نیند اور ان خراٹوں سے بڑی چڑ ہے۔ لیکن اب اس کو اس بے چارگی اور معصومیت کے

عالم میں اپنے پیروں پر لیٹا دیکھ کر بہت پیار آجاتا ہے اور یہ ظالم پیار ——— ! یہ ظالم پیار میرے سارے جسم میں جیسے برف کو پگھلا دیتا ہے۔ اس کو پھر سے تکیئے پر سیدھا لٹاتے ہوئے میں اپنی کمزوری کا اپنے دیس والوں سے مقابلہ کرتا ہوں۔ یہ دیس پیار و محبت کے لئے کتنا بدنام ہے ——— !

ایک ہندوستانی کی زندگی کا صرف ایک ہی مصرف ہے اس کو حکومت نہ دو۔ آزادی مت دو۔ کھانا کپڑا چھین لو۔ صرف ایک عورت دے دو۔ وہ ساری عمر اس کی کاکلیں سنوارتا رہے گا۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر زندگی اور موت دونوں کو بھول جائے گا۔ اس کے ہونٹوں کا امرت پیتا رہے گا اور جیتا رہے گا۔

یہ صرف تاج محل کی سرزمین ہے۔ یہاں چپے چپے پر تاج محل کھڑا ہے یہ میرا تنگ و تاریک تکونا گھر تاج محل سے کچھ کم ہے۔ یہاں کتنی خاموش پُرسکون اور پُرامن محبت سانس لے رہی ہے۔ یہ میری ممتاز محل جو ابھی ابھی میرے پاؤں داب کر سوگئی ہے۔ خود کو ذلیل کر کے مجھے کتنا بلند رتبہ عطا کیا ہے۔ یہ ذہنیت میرے دیس کی اجتماعی ذہنیت ہے ——— بڑی کہن اور تاریخی خود کو ذلیل کر کے دوسروں کو بلند رتبہ عطا کرنے والی یہ ذہنیت کبھی آر پاؤں

کے کبھی مغلوں کے اور کبھی انگریزوں کے کام آتی رہی اور آج اسی ذہنیت نے مجھے مجازی خدا بنا دیا ہے ——— پتی دیوتا! یہ خطاب سن کر مسرت سے میرے ہونٹ کھل جاتے ہیں۔ کیا پرواہ کہ میری تنخواہ صرف چالیس روپیہ ماہوار ہے۔ کیا ہرج کہ مجھ پر چارسو روپئے قرض کا بوجھ ہے۔ کیا مضائقہ کہ میں دن میں فقط دو ہی وقت کھانا کھاتا ہوں ——— ارے دیوتا ہوں۔ اور دیوتا تو میری ہی طرح بے نیاز ہوتا ہے۔

مجھے اپنی داسی پہ رحم آ گیا۔ اور میں کہنی کے سہارے اُٹھ کر پیار بھری نظروں سے اُسے دیکھنے لگا۔ لالٹین کے مدھم اُجالے میں اس کے روپہلے چمکیلے چہرے پر سکون اور شانتی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ پھوٹ کر پھیل گئی تھی شاید وہ اپنے پتی دیوتا کے چرن چھو کر خواب میں بھی اس کے پاؤں داب رہی ہے۔ مجھے اس کی اس حرکت پر کوئی اعتراض نہیں۔ مگر غصہ اس بات پر ہے کہ یہ اس کی مستقل عادت بن گئی ہے۔ عورت کو مرد کے پاؤں دابنے کے لئے ہی تو تخلیق نہیں کیا گیا ———!

اس عادت کے بجائے اس کو ہمیشہ مسکرانے کی عادت ہو جائے تو کیا ہی اچھا ہو۔ اپنی مفلسی اور قنوطیت کے روگ سے نجات کے لئے مجھے صرف اپنی عورت کے مسکراتے ہوئے

ہونٹ چاہئیں۔ عورت کے بارے میں میرا معیار حسن یہی ہے کہ جو عورت ہنس مکھ ہے وہ بلاشبہ حسین ہے خواہ اس کا رنگ چاکلیٹی ہی کیوں نہ ہو۔

اب میری بیوی خواب میں مسکرا رہی ہے ——

واللہ کتنی حسین نظر آ رہی ہے۔ جب عورت نیند میں مسکراتی ہے.... ہائے فتنۂ خاموش! تکیئے پر پریشان زلفیں، فرض سے سبکدوشی کے احساس سے مطمئن، مسرور، چمکتا، دمکتا چہرہ ......

اور مسکرانے کی یہ پیاری ادا —— !

میں نے علی گڈھ کی نمائش میں ایک تصویر دیکھی تھی۔ جس میں بہت سے سیاہ فام انسان اپنی جھکی ہوئی کمروں پر بڑے بڑے بوجھ لادے، لوہے کی موٹی موٹی زنجیروں سے جکڑے ایک پہاڑ پر چڑھ رہے تھے۔ مگر ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ ایسی ہی مسکراہٹ جیسی کہ اب میری بیوی کے گلابی پنکھڑیوں جیسے ہونٹوں میں رچی ہوئی ہے —— اس تصویر کے نیچے لکھا تھا —— "ہمارے اسلاف"۔

میری بیوی اور میرے اسلاف —— ان میں مجازی خدا کا تخیل بڑی شدت سے کارفرما ہے۔ یہ بیرداہتے بوجھ اٹھاتے —— مگر مسکراتے رہے۔

میں نے ایک وارفتگی کے عالم میں اپنی رفیقہ کے ہونٹوں کی

مسکراہٹ اپنے ہونٹوں میں بھر لینی چاہی ـــــــ اور وہ جاگ پڑی۔ جب اس کی پلکوں کے مخملیں غلاف ہٹے تو اندر سے پیالوں میں سُرخ شراب چھلکتی نظر آئی ـــــــ مگر شرما کر اس نے کروٹ بدلی اور پھر سو گئی۔ ہائے تیری کم نگہی ساقی! میں چاہتا تھا کہ وہ نہ سوئے اور میرے ساتھ جاگتی رہے۔ مگر لالٹین کا اُجالا اتنا مدھم تھا کہ وہ میرے چہرے پر چھائے ہوئے جذبات کو نہ دیکھ سکتی تھی اور نہ سمجھ سکتی تھی کہ عورت کو بھی مرد کے ساتھ جاگنا چاہیئے۔ اس لالٹین کے مدھم اُجالے میں اس نے صرف یہ دیکھا ہے کہ میں نے شب خوابی کے کپڑے پہن لئے ہیں یا نہیں۔ میں نے مسواک کر لی ہے یا نہیں ـــــــ اس نے میرا چہرہ اور اس پر چھائے ہوئے تفکرات کو نہیں دیکھا ـــــــ بھلا کیسے دیکھ سکتی تھی۔ دیوتا سے بھی کوئی آنکھ ملاتا ہے۔ مذہب نے اسی لئے تو عورت کے چہرے پر گھونگھٹ کھینچ رکھا ہے کہ وہ کچھ نہ دیکھے۔ کچھ نہ سمجھے صرف پیر دابتی رہے۔

آدھی رات ہو گئی۔ مگر میری انگریز پڑوسن کے گھر ابھی پیانو بج رہا تھا۔ وہ اونچے سُروں میں شیلے کا سانیٹ الاپ رہی ہے۔ وہ ابھی جاگ رہی ہے وہ تو عرصے سے جاگ رہی ہے۔ مگر یہاں میری بیوی پر ایک خوابِ گراں طاری ہے۔ بیچاری

پاؤں دابتے دابتے بہت تھک گئی ہے ——— میری بیوی ——— اور ——— اور میرے اسلاف بھی....

میں اس وقت بہت ساری باتیں بآواز بلند کہنا چاہتا تھا۔ مگر کہوں تو کس سے کہوں۔ لالٹین بجھ گئی تھی۔ گہرا اندھیرا ٹھاٹھیں مار رہا تھا ——— ناچار میں نے ایک سگریٹ جلائی۔ میری اندھیری زندگی میں جو تھوڑی بہت روشنی ہے وہ سگریٹ ہی کے ننھے شعلے سے پیدا ہوئی ہے۔ زندگی تھوڑی بہت جو نشیلی ہے وہ سگریٹ ہی کے دھوئیں سے ——— میں اور مجھ جیسے انسان جنھیں کھانے کے لئے غذا ——— پہننے کے لئے کپڑے ——— اور رہنے کے لئے ٹھکانا نہ ہو۔ جب ایک سگریٹ سلگا لیتے ہیں تو پہلے ہی کش میں زندگی کے درد میں وہ ہلکا ہلکا سا لطیف مزہ سرایت کر جاتا ہے جو کسی مفت ہاتھ آئی ہوئی بدصورت عورت کو خوبصورت متصور کرنے میں محسوس ہوتا ہے مجھے یقین ہے کہ ہندوستان میں جتنی سگرٹیں پی جاتی ہیں اتنی کسی ملک میں نہیں پی جاتیں۔ ہندوستان کے سارے شہروں اور دیہاتوں کی سڑکوں اور گلی کوچوں پر پھینکے ہوئے سگرٹوں کو اٹھا کر اگر بحر ہند میں پھینک دیا جائے تو سگرٹوں کا ایک جزیرہ بن جائے ——— واللہ کیا سوجھی ہے ——— دی آئی لینڈ آف سگارٹس ——— یعنی ہندوستانی دکھ کا ایک

نشان ———

یہ میرا آٹھ برس کا لڑکا جو اپنی چھوٹی سی پلنگڑی پر سردی کے مارے پیٹ میں گھٹنے دبائے سو رہا ہے۔ آج ہی شام سڑک پر سے سگریٹ پیتا چلا آرہا تھا۔ مجھے معلوم ہے کہ اس نے فرید خاں کے لڑکے رشید خاں کی بدولت سگریٹ پینا سیکھا۔ اور رشید خاں نے اپنے باپ فرید خاں سے ——
اب یہ فرید خاں کی غلطی تھی کہ اس نے اپنے سن شعور کی طرف بڑھتے ہوئے لڑکے کی موجودگی میں اپنی بیوی سے کہا ——— "بیگم جب میری جیبیں خالی ہوتی ہیں اور گھر میں چولھا نہیں سلگتا۔ اس وقت جب میں ایک سگریٹ جلا لیتا ہوں تو بخدا جیبیں بھرنے اور چولھا سلگانے کی ایسی ایسی ترکیبیں ذہن میں آتی ہیں کہ کچھ بتا ہی نہیں سکتا ——— یہی جملہ رشید خاں نے میرے لڑکے سے بدل کر کہا ——— یار جب اسکول کی فیس خوانچے والے کی نذر ہو جاتی ہے اس وقت میں ایک سگریٹ جلا لیتا ہوں اور ایسی ایسی ترکیبیں ذہن میں آتی ہیں کہ ...... سگریٹ سے سگریٹ جلنے لگی۔ اور اہی اوٹ پٹانگ خیالات میں نہ جانے کب سو گیا۔ ایک خواب سے دوسرا خواب۔

میں نے دیکھا کہ خیراتی ہسپتال کے ایک پلنگ پر میری بیوی درد سے کراہ رہی ہے۔ اور ایک لیڈر ڈاکٹروں کی طرح اسٹھسکوپ کانوں سے لگائے مرض کی تشخیص میں مصروف ہے۔ غصے سے میرے تن بدن میں شعلے بھڑکنے لگے اور میں چیخ پڑا ——— ارے تم۔ تم علاج معالجہ کیا جانو۔

جاؤ وہاں۔ پنڈال میں ہزاروں بے وقوف تمھاری پیپرمنٹ جیسی میٹھی باتیں چپ چاپ ہضم کرنے کو تیار بیٹھے ہیں۔ میں ڈاکٹر کو لینے جا رہا ہوں —— ڈاکٹر —— ڈاکٹر —— ! ڈاکٹر نیند میں بڑبڑانے لگا۔ "اُدیوفول —— تم نے میرا خواب توڑ دیا۔ میں مس اوشا بنرجی کے ساتھ سینے سے سینہ، ہونٹ سے ہونٹ ملائے ناچ رہا تھا —— ہائے مس اوشا —— مائی سویٹ اوشا —— ! اس کے لطیف ہاتھ کی لمس ......

میں نے اپنے کندھے پر ایک لطیف ہاتھ کا لمس محسوس کیا۔ جو مجھے دھیرے دھیرے جھنجوڑ رہا تھا۔

"اُٹھیے —— اُٹھیے۔ سویرا ہو چکا"

سویرا —— ! ہو نہہ ! میں اٹھ بیٹھا۔ سچ مچ سویرا ہو چکا تھا۔ ہمارے گھر کا یہ دستور تھا کہ ہم دونوں میں جو پہلے جاگ اُٹھتا۔ وہ دوسرے کو جگا دیا کرتا۔ مگر صرف صبح سے —— رات تک کے لئے۔ اور صبح سے رات تک کا اُجالا کتنا مختصر ہوتا ہے —— !

منہ ہاتھ دھو کر میں باورچی خانے میں گیا۔ میری بیوی ناشتہ تیار کر رہی تھی۔ باورچی خانے میں لینن کا یاد آجانا کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ جب کہ اس نے کہا تھا کہ ہر باورچی کو چاہیئے کہ وہ نظام سلطنت چلانا سیکھے۔ میں اس وقت اپنی بیوی —— اپنی باورچن کو نظام سلطنت چلانا تو نہیں سکھانا چاہتا تھا اور یہ حیثیت ایک غلام کے یہ بات مجھ سے بعید بھی تھی مگر میں کسی طرح اس کو یہ ضرور بتا دینا چاہتا تھا کہ آج سے پیر چھونے اور پاؤں دابنے کی رسم کہن کو

ہمیشہ کے لئے ختم کر دینا چاہتا ہوں۔ مگر کہہ نہیں سکا کیونکہ وہ بہت مصروف
تھی اور ایسی باتیں کہنے کے لئے تو ایک پر امن فضا نہایت ضروری ہے۔

ناشتہ کرنے کے بعد چائے کی پیالی ختم کرتے ہوئے میں نے گاؤ
تکیہ سے لگ کر بیٹھتے ہوئے سوچا کہ اب یہاں سکون طاری ہے اور وہ
بات مجھے کہہ دینی چاہیئے۔ مگر باہر سے کواڑ کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔ اور
میری بیوی نے ناز سے صورت بگاڑتے ہوئے کہا۔

"لیجئے —— آگئے آپ کے جاپانی۔"

میری بیوی میرے پڑوسی کلرک دوست کو جاپانی کہتی ہے۔
کیونکہ وہ بیچارا چھوٹے قد کا، زرد رو، فربہ اندام ہے۔ اس کو سبھی جاپانی
کہتے ہیں۔ اس کا نام مذاق میں اد نما شنکر سے "ٹما شیٹو" ہو گیا ہے۔
میری بیوی ٹما شیٹو سے بڑی چڑتی ہے۔ جو بار بار دروازہ کھٹکھٹا کر کا سکون
درہم برہم کر دیتا ہے۔

میں باہر بیٹھک میں آیا۔ ٹما شیٹو پہلے مسکرا کر اور پھر رونی صورت
بنا کر کہنے لگا۔

یار —— صاحب، کا حکم ملا ہے کہ ہم دونوں کو
افضل پور کے جنگلوں کا چھ میل سروے کرنا ہے۔ موت
آجائے صاحب کو ——"

میں نے کہا:۔

ارے آہستہ بول —— ہندوستان کے گھروں کی دیواروں کے

بھی کان ہوتے ہیں۔ کہیں میر جعفر کی کوئی اولاد نہ چھپی بیٹھی ہو کہیں ــــــــ"

ہم دونوں ہنس پڑے اور میں کپڑے پہن کر اس کے ساتھ باہر نکلا۔ کھڑکی سے جھانکتی ہوئی بیوی کی جبیں خشمگیں تھی۔

دن بھر دھوپ دھول گرمی اور مسافت نے نڈھال کر دیا۔ جب شام گھر لوٹا تو جلد ہی کھانا کھا کر چارپائی پر لیٹ گیا۔ میرے رگ و پے میں عجیب کھنچاؤ اور تناؤ پیدا ہو رہا تھا۔ میری بیوی نے عادتاً میرے پیر چھوئے اور پاؤں دابنے بیٹھ گئی۔ میرے سارے جسم میں ہلکی ہلکی میٹھی میٹھی سی جھرجھری دوڑنے لگی۔ اور میں نے سکون اور لذت سے آنکھیں بند کر لیں۔ اور سوچا کہ بہت اچھا کیا جو اس کو یہ نہ بتایا کہ پیر چھونا اور پاؤں دابنا بڑی غلامانہ حرکتیں ہیں۔

تمغہ

آسمان پر سپید سپید بادل چھائے ہوئے تھے۔ دنیا ایک سپید بالوں والی بوڑھی عورت کی طرح فسردہ اداس اور سنجیدہ نظر آرہی تھی۔ ابھی دوپہر بھی شروع نہ ہوئی تھی لیکن بادلوں کے دھندلے اُجالے نے سانولی شام کو ابھی سے اپنے آغوش میں گھسیٹ لیا تھا۔

بندرگاہ کی کلاک نے بارہ بجائے اور ساحل پر کھڑے ہوئے ہزاروں انسانوں میں کھلبلی سی مچ گئی۔ سب انتظار سے چمکتی دمکتی آنکھوں سے سامنے سمندر اور آسمان کو ملانے والی دھندلی افقی لکیر کو دیکھنے لگے جہاں سے کالے گاڑھے دھوئیں کی ایک موٹی لکیر ہزار جگہ سے اپنی کمر لچکاتی بادلوں کے سپید نرم ملائم گالوں کو چوم رہی تھی۔

جہاز آرہا ہے ——— جہاز آرہا ہے۔ ہزاروں زبانیں اشتیاق، آرزو، اُمید اور حسرت سے بیقرار ہو کر بولنے لگیں۔ واقعی جہاز آرہا تھا۔ اس جہاز کی آمد کا سب کو بڑے طویل عرصے سے انتظار تھا۔ اب یورپ میں سرمایہ داروں کی سب سے بڑی خونریز لڑائی ختم ہو چکی تھی۔ اور اس جہاز سے کسی کا باپ، کسی کا لاڈلا،

کسی کا شوہر، کسی کا بھائی، کسی کا عاشق، کسی کا منگیتر سورماؤں کی وردی میں ملبوس۔ سینے پر تمغے اور زخموں کے نشانات سے سجا سجایا ہنستا مسکراتا آنے والا تھا ـــــ پھر یکا یک ایک نوجوان عورت ایک بوڑھی ضعیفہ کے کندھے پر لمبی لمبی انگلیوں والا ہاتھ رکھے پنجوں کے بل کھڑی ہو گئی اس نوجوان عورت کے گال بھی بادلوں کی طرح، نرم اور ملائم تھے لیکن جوانی کی لال لال شفق نے ان بادلوں کو گلابی کر دیا تھا۔ وہ ایک ہلکے پیلے رنگ کی شلوار پہنے ہوئے تھی اس کے گداز جسم پر گہرے ہرے رنگ کی قمیص جلد کی طرح منڈھی ہوئی تھی۔ اور ہلکے پیلے رنگ کا دوپٹہ آدھے سر تک ڈھلک آیا تھا۔ اس کی زلفوں کی لمبی ناگن اپنے سرخ موباف کی دو چھوٹی چھوٹی زبانیں نکالے کمر سے بھی نیچے لہرا رہی تھی۔ ابھرتے ہوئے جہاز کی لمبی چمنی کو دیکھ کر وہ ایک اضطراری اور بے ساختہ لہجہ میں بولی ۔

"ہاں جی ـــــ جہاز ...... !"

اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اس عورت کا دہن وہ ساز ہے جس سے ایسا جاں نواز نغمہ پیدا ہوتا ہے جو مرنے والے کو موت کی سنسان آغوش میں بھی چونکا دے۔ اس کے گلے سے جو سُر پیدا ہو وہ نہ ستار کے کسی تار میں ہے اور نہ بنسری کے کسی سوراخ میں۔ میں نے اپنی زندگی میں بیسیوں طوائفوں اور ایکٹرسوں کا گانا سنا ہے۔ قسم قسم کی مٹھائیاں کھائی ہیں۔ لیکن جو مٹھاس اس نوجوان عورت کے پُرشوق

پر اُمید، بے ساختہ اور ادھورے جملے میں تھی، اُس سے میری غلام، مفلس، تشنہ کام، دکھیا روح کی ساری تلخی زائل ہو گئی اس کی آواز میرے لئے جیسے دو سپنوں کے درمیان کی کڑی تھی۔ اس کی مدبھری آواز سننے سے پہلے میں اپنے ضدی چھوٹے بھائی کے انتظار میں ڈوبا ہوا تھا۔ جو خاندان کی مفلسی دور کرنے، اپنی بیوی، ماں اور بھائی کے لاکھ منانے سمجھانے گڑگڑانے کے باوجود جنگ میں بھرتی ہو کر چلا گیا تھا۔ اور اب اسی جہاز سے یچھم کی سب سے بڑی خونریز لڑائی جیت کر واپس آرہا تھا۔ لیکن اس عورت کی مُردے کو بھی جلانے والی سحر آگیں، باریک میٹھی آواز سے چونک پڑا۔ جاگ اُٹھا۔ مگر اس آواز کے جادو نے، نشے نے، جلد ہی میرے سارے جسم پر پھر سے نیند طاری کر دی۔

اور جب میں جہاز کی کوک سُن کر چونکا۔ اس وقت اس حسینہ کی ساتھی بوڑھی عورت کی پوپلی منمناتی ہوئی آواز سنی۔

. . . . . . میرا مجید خاں اپنے باپ کی طرح سینے پر چاندی سونے کے تمغے لگائے ہنستا مسکراتا جہاز سے اترے گا۔ پچھلی لڑائی میں اس کا باپ کیسے بڑے بڑے سنہرے روپہلے تمغے لگائے آیا تھا۔ میرا مجید خاں ــــــ پروردگار تو اسے صحیح سلامت لائیو۔ محبوب سبحانی کے مزار پر سبز رنگ کا غلاف چڑھاؤں گی

——— ہر رات مسجد میں گھی کا چراغ جلاؤنگی۔"

گلبدن نے مجید خاں کا نام سُن کر ہواؤں سے کھیلتا ہوا دوپٹہ پھر سے بھرپور اوڑھ لیا۔ اور مجھے معلوم ہو گیا کہ مجید خاں صرف اس بوڑھی عورت ہی کا نہیں، بلکہ اس گلبدن کے ابھرے ہوئے گول سینے کے اندر چھپی ہوئی دھڑکن بھی ہے ——— کتنا خوش نصیب ہے وہ مجید خاں ——!

جہاز اب صاف نظر آ رہا تھا۔ اس کے سب سے اونچے مستول پر فتح کا سُرخ پھریرا لہرا رہا تھا۔ اور عرشے پر کیولری بینڈ نصرت اور مسرت کے دلآویز نغمے فضا میں بکھیرتا آ رہا تھا۔ ہجوم بھنبھنانے لگا۔ باپوں، بیٹوں، بھائیوں، شوہروں، منگیتروں اور عاشقوں کی سلامتی کی دُعائیں مانگی جانے لگے۔ جیسے جیسے جہاز نزدیک آتا جا رہا تھا۔ ہجوم میں کھلبلی، بے چینی، اضطراب، بے قراری، بڑھتی جا رہی تھی۔ اور جب جہاز نے لنگر ڈال دیا تو ہجوم اور جہاز کے درمیان بیقرار، منتظر متلاشی نظروں کا جال سا بچھ گیا .... میرا باپ! میرا بیٹا! میرا بھائی! میرا شوہر! میرا منگیتر! میرا محبوب ......!

ہجوم کو قابو میں رکھنے کے لئے مقامی فوج کے دستوں نے موٹے موٹے رسے گھیر رکھے تھے۔ پہلے کیولری بینڈ کا دستہ فتح کا سُریلا نغمہ بجاتا جہاز سے اترا اس کے بعد زخمی سپاہیوں کو بانس اور کپڑے سے بنائے ہوئے اسٹریچروں پر لٹا کر اتارا جانے لگا۔ جب سب سے اخیر میں موٹا توندیل کپتان جہاز سے اتر رہا تھا اس وقت فضا میں

لاتعداد چیلیں منڈلانے لگیں۔ ساحل کی ریت پر ان گنت۔ لاتعداد زخمی مجروح جاں بلب سپاہیوں کے جسم قطار اندر قطار لٹا دیئے گئے تھے۔

اس وقت ہجوم میں چند سپاہی گھس آئے اور مجمع میں کاغذ کی رنگ برنگی پرچیاں تقسیم کرنے لگے۔ میں نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے ایک پرچی لی۔ اور دھڑکتے ہوئے دل، اور سہمی ہوئی نظروں سے پڑھنے لگا۔

گوربخش سنگھ ——— ہلاک

فیض خاں ——— ہلاک

راج ——— زخمی

مصطفیٰ بیگ ——— زخمی

شیام سندر ——— ہلاک

اکبر خاں ——— زخمی

چھوٹو رام ——— ہلاک

شانتی سروپ ——— زخمی

عزیز خاں ———

اور آگے نہ پڑھ سکا۔ آخر ہلاک ہو گیا۔ وہ خاندان کی مفلسی اور نحوست دور کرنے والا سورما! بیوی، ماں اور بھائی کی منت و سماجت کو دھتکار بتا کے گیا تھا۔ وہ بہادر! ضدی، ناعاقبت اندیش،

کم سمجھ ——— ! مجھے چکّر سا آنے لگا۔ اور میں وہیں ریت پر بیٹھ گیا۔ اگر میری نظروں کے آگے فتح کا وہ سُرخ پھریرا نہ لہراتا ہوتا اور کیولری بینڈ فتح کے سُریلے، مسرت آگیں نغمے نہ الاپتا ہوتا تو شاید زخمیوں کی کراہ اور ساحل کے اس مہیب نظارے سے گھبرا کر میں بے ہوش ہو گیا ہوتا ——— میرا دل تیز تیز دھڑکنوں کی تاب نہ لا کر پھٹ گیا ہوتا ——— میں مر گیا ہوتا۔

لیکن اس وقت اس بوڑھی عورت نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھ میں کپکپاتی پرچی میری آنکھوں کے آگے بڑھا دی اور امید و بیم سے بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"بیٹا ——— ذرا اسے بھی پڑھ دینا۔ احسان ہوگا۔" میں رندھے ہوئے گلے سے بمشکل آواز نکالتے ہوئے پڑھنے لگا۔

عزیز خاں ——— ہلاک

رام دیال ——— زخمی

واحد حسین ——— زخمی

بہاری لال ——— ہلاک

دلیپ سنگھ ——— ہلاک

مجید خاں ——— زخمی

بوڑھی عورت کی پھٹی پھٹی چیخ کے ساتھ ایک تیز مگر مہین سی چیخ میرے کانوں سے ٹکرائی۔ بوڑھی عورت آسمان کی طرف دونوں

ہاتھ اُٹھائے چیخ رہی تھی۔

اے پروردگار ــــــ یہ کیا ہو گیا ــــــ؟

اے پروردگار ــــــ!

اس عورت کی سوئیوں کی طرح نوک دار تیز سسکیاں میرے دل میں چبھنے لگیں۔ لیکن کیولری بینڈ اس زور شور سے فتح کا نغمہ بجا رہا تھا کہ اس گلبدن کی تیز نوکیلی سسکیاں ابر آلود آسمان میں ایک بھی سوراخ نہ کر سکیں اور اس بوڑھی عورت کی چیخیں اس کے پروردگار تک پہنچ ہی نہ سکیں۔

ہجوم آہستہ آہستہ کم ہونے لگا۔ ایمبولنس کاروں کی کوکھوں میں تمام زخمیوں کو بھر دیا گیا تھا۔ اور منڈلاتی ہوئی چیلیں مایوس ہو کر آسمان کے مغربی کناروں کی طرف اڑنے لگی تھیں۔

سب چلے گئے تھے۔ لیکن میں وہیں ریت پر بیٹھا ہوا اپنی مٹھی میں مروڑے ہوئے فتح کے سُرخ پھریرے کو دیکھ رہا تھا۔ سمندر کی لہریں اچھلتی ناچتی میرے قریب تک آ جاتیں۔ لیکن پھر سامنے والی چھوٹی سی چٹان کے سخت گال پر طمانچے لگا کر کھلکھلاتی لوٹ جاتیں۔ جہاز فاتحانہ انداز میں سر اُٹھائے چپ چاپ کھڑا تھا اور میں اس کے سب سے اونچے مستول پر لہراتے ہوئے جھنڈے میں ماؤں بہنوں، شوہروں، منگیتروں اور عاشقوں کے خون کی سُرخیاں دیکھ رہا تھا اس کی سرسراہٹ میں بیواؤں منگیتروں اور محبوباؤں کی سسکیاں

سُن رہا تھا۔
آسمان پر جب ایک بھولی بھٹکی، بھوکی لالچی چیل منڈلاتی نظر آئی تو مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ اور میں نے اپنے آپ کو بھول کر، فتح کے پھریرے کی عظمت کو بھول کر بڑی غصیلی آواز میں کہدیا۔۔۔
شُت ـــــ اڑ جا یہاں سے ـــــ میرے
بھائی کی لاش یہاں کہاں۔ وہاں پچھم کے میدانوں میں
کہیں سڑ گل رہی ہوگی اس کی لاش کی تکا بوٹی کر ڈال
ـــــ اور ہو سکے تو ایک بوٹی میرے دامن میں بھی
پھینک دے میں اس ضدی ناعاقبت اندیش، کم سمجھ
چھوکرے کی ایک ہی بوٹی کی قبر بنانا چاہتا ہوں ـــــ
چیل آسمان میں ایک گہرا غوطہ لگا کر نکل گئی اور میں اپنی مٹھیوں میں ریت بھرے سو سو من کا ایک ایک قدم اُٹھاتا گھر کی طرف جانے لگا۔
سرکاری عمارتوں، اور گرجاؤں پر فتح کے سُرخ سُرخ پھریرے لہرا رہے تھے اور ادھر گورنر لاج سے فوجی بینڈ کی دھیمی دھیمی سریلی آواز بھی سُنائی دے رہی تھی۔ مگر یہ آواز اتنی سُریلی کہاں۔ اس سے زیادہ سُریلی تو مجید خاں کی حسینہ کی سسکیاں تھیں اس کی سسکیاں سن کر تو مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا تھا جیسے کوئی رومانوی شاعر کسی خوبرو محبوبہ کی یاد میں میٹھے میٹھے شعر ٹھنڈی سانسوں میں پڑھ رہا ہو۔
فوجی ہسپتال کے قریب پہنچ کر میں نے سوچا کہ اب اتنی جلدی گھر

جا کے بھی کیا کروں مانا کہ میری بھابی زچگی کی کھاٹ پر پڑی صدر دروازے کو پلک جھپکائے بغیر دیکھ دیکھ کر اپنے سورما دولھا کا انتظار کر رہی تھی لیکن انتظار میں تو بڑا کیف، لطف اور مزہ ہوتا ہے۔ اور میں اتنا بد مذاق نہیں کہ بیچاری کو انتظار کے میٹھے رسیلے خواب سے چونکا دوں۔ شاید میرے بھائی کی آغوش میں اس کو اتنا مزہ میسر نہ آسکے جتنا کہ اس انتظار میں ہے۔ اب تو وہ اپنی آخری سانس تک اس کا انتظار کرے گی۔ اور انتظار کے ان کبھی ختم نہ ہونے والے لمحات میں وہ اپنے شوہر سے ہم آغوش ہونے کے نئے نئے طریقے میٹھی میٹھی باتیں پیار بھرے گلے شکوے سوچتی رہے گی۔

آخری خط میں اس کے شوہر نے لکھا تھا کہ مجھے کیمپ کے سب سے بڑے بادشاہ نے بہادری کا سنہرا تمغہ اپنے ہاتھ سے اس کے سینے پر لگایا تھا۔ وہ بیچاری اس تمغے کو دیکھنے کی بڑی مشتاق تھی۔ مجھ سے ہمیشہ پوچھا کرتی تھی کہ وہ تمغہ کیسا ہوتا ہے؟ وہ کیوں لگایا جاتا ہے؟ اور کتنے تولے سونا ہوتا ہے۔ اس تمغے میں ———— ؟ اب اس کو سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ جب میں اس کے سورما دولھا کی سرفروشی کا قصہ سناؤں گا، تو وہ سنہرا تمغہ اس کے دل میں خود بخود لگ جائے گا اور دن بدن بڑا اور چمکیلا ہوتا جائے گا۔ وہ اپنے دھڑکتے ہوئے دل پر ہاتھ پھیر پھیر کر اس کو ٹٹولنے کی کوشش کرے گی اس کا لمس محسوس کرنا چاہیے گی لیکن وہ تمغہ اس کے ہاتھ نہیں آئے گا۔ اور نہ وہ اس کو دیکھ سکے گی۔ واللہ کیا مذاق کیا ہے اس کے شوہر نے ———— ! اپنی بہادری کا

تمغہ اپنی بیوی کے دل میں چھپا دیا۔ جہاں وہ ڈھونڈھ ہی نہیں سکتی
.... لاکھ ضبط کے باوجود میں اپنے آنسو نہ روک سکا۔
رومال سے اپنے آنسوؤں کی دھند صاف کی تو ہسپتال کے احاطے
میں پھر وہی مجید خاں کی گلبدن نظر پڑی جو اپنی ضعیف ساس کا ہاتھ
تھامے نڈھال ناتواں قدموں سے زخمیوں کے وارڈ کی سیڑھیاں
چڑھ رہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ گلبدن بیاہتا ہے ابھی سہاگن ہے۔
اور اتنی عفت مآب ہے کہ شوہر کا صرف نام سن کر سر پر دوپٹہ اوڑھ لیتی
ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس کو دیکھتے ہی میرے دل میں ناپاک سی
خواہشیں پیدا ہوتی تھیں۔ یہ میری بچپن کی خراب تربیت، جوانی کے
آوارہ کردار اور ابتدا سے خراب صحبت کا نتیجہ ہیں ——— لیکن
ایک غلام ملک کے غلام باشندے کی تربیت کیا، جوانی کیا، کردار کیا،
صحبت کیا ——— اگر میرا کردار اور میری جوانی غلامی کے ہاتھوں
نہ پھنسے ہوتے اور اگر میرے پھیپھڑے کمزور نہ ہوتے تو شاید میں
سیدھا گھر چلا جاتا۔ لیکن اس کی کمر سے بھی نیچے لہراتی ہوئی لمبی چوٹی
مجھے ہسپتال میں کھینچنے لگی۔ پھر سوچا کہ اب گھر جا کے بھی کیا کروں گا۔
میری بھابی اپنے سہاگ کے ویرانے پر لوٹ لوٹ کر ایسی ڈراؤنی خوفناک
چیخیں مارے گی کہ فتح کے بینڈ کا مسرت آگیں، مدھر اور میٹھا رسیلا نغمہ
مطلق نہیں سنائی دے گا۔ کتنی صعوبتوں کتنے قحطوں ——— کتنی
خونریزی اور کتنے کٹھن انتظار کے بعد تو آج یہ فتح کا نغمہ سنائی دے رہا ہے۔

اپنی بھابی کی ڈراؤنی چیخیں تو اب روز ہی سننا پڑیں گی۔ لیکن یہ فتح کا جاں نواز نغمہ روز روز تھوڑے ہی سنائی دے گا۔ جانے کب کتنے سال بعد خونریزی ہو اور یہ سریلا نغمہ کب سنائی دے ——؟

زخمیوں کے وارڈ کی کھڑکی سے میں اس حسینہ کو دیکھنے لگا۔ میری آنکھیں اس کے چکنے چکنے گول رخساروں پر پھسلتی جا رہی تھیں۔ پھر نظریں جماتا، پھر پھسل جاتیں۔ کتنے مدور، کتنے رسیلے۔ اور کتنے چکنے تھے اس کے گال ——!

اس کا خوش نصیب شوہر بستر پر لیٹا مسکراہٹ سے ادھ کھلے ہونٹوں سے دبی دبی کراہ میں جانے کیا کہہ رہا تھا، اور اس کے موٹے موٹے شفاف آنسوؤں میں جانے کیا دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کے سینے پر آنسوؤں سے بھیگا ہوا گال رکھے سسک سسک کر رو رہی تھی۔ جب ڈاکٹر وارڈ میں آیا تو ضعیفہ نے بڑھ کر اس کو مجید خاں کے سینے پر سے اٹھا لیا۔ اور اس کے سر پر دوپٹہ اوڑھا دیا —— مجید خاں نے اپنی دوپٹہ اوڑھی ہوئی عفت مآب بیوی کی طرف آخری بار دیکھنا چاہا لیکن شاید اس کی نظر اس کے چہرے کو چومنے سے پہلے ہی لوٹ آئی اور ہمیشہ کے لئے بند ہوتے ہوئے پپوٹوں میں چھپ گئی۔

بے اختیار میری آنکھوں میں آنسو آ گئے مگر میں یہاں آنسو بہانے تو نہیں آیا تھا جھلا کر کھڑکی سے ہٹ گیا۔ ایک سگریٹ جلا کر پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا گھر پہنچا۔ جونہی

دروازے میں قدم رکھا صدر دروازے کو ٹکٹکی باندھے دیکھنے والی بھابی نے اپنے سر پر دوپٹہ کھینچ لیا۔ جی چاہا کہ اس کا گھونگٹ کھینچ کر پوچھوں کہ اب تجھے دوپٹہ اوڑھنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ آج جب کہ جگہ جگہ فتح کے سُرخ سُرخ پھریرے فضا میں بلند ہو کر لہرا رہے ہیں کسی عورت کو دوپٹہ اوڑھنے کی ضرورت ہی کیا ہے ——— اور یہ دوپٹے ان پھریروں کی طرح کہاں اتنے رنگین سربلند اور پروقار ہیں .... لیکن گلے میں تو جیسے میرے سورما بھائی کا سنہرا تمغہ اٹک گیا تھا۔

رقیب

...... ریل دوڑی جا رہی تھی۔ ڈبے میں میرے سوا تین اور مسافر تھے۔ ایک اینگلو انڈین حسینہ جس کے گہرے اودے رنگ کے فراک سے اس کی سپید اور چمکیلی باہیں یوں نکلی ہوئی تھیں جیسے گہرے اودے رنگ کے بادل میں چھپے ہوئے چاند سے پھوٹتی ہوئی کرنیں۔ ... دوسرا ایک ادھیڑ عمر کا پارسی بورژوا جو ڈربی ریس ہار کر بمبئی سے واپس ہو رہا تھا تیسرا ایک سرخ ٹماٹر جیسا اسکاچ سپاہی جو چور نظروں سے اس اینگلو انڈین حسینہ کو دیکھ دیکھ کر انگریزی موسیقی کے اوٹ پٹانگ سُروں میں گا رہا تھا۔

مائی ہارٹ از اِن دی ہائی لینڈس ——— میرا دل ہائی لینڈ میں ہے ——— میرا دل....... "

میں نے دیکھا۔ وہ حسینہ اسکاچ سپاہی کی دزدیدہ نظروں سے گھبرائی ہوئی تھی۔ اس کی گھبرائی ہوئی نظریں کبھی مجھ پر اور کبھی اس ادھیڑ عمر کے پارسی بورژوا پر پڑ رہی تھیں۔ جو ٹائمز آف انڈیا کے کالموں میں کھویا ہوا تھا۔ وہ حسینہ اس گھبراہٹ میں بہت خوبصورت معلوم ہو رہی تھی۔ یوں تو بدصورت عورت بھی گھبراہٹ میں بہت خوبصورت معلوم ہوتی ہے لیکن وہ حسینہ تو گھبرانے کے علاوہ مبہم بھی ہو رہی تھی۔ اور حُسن مبہم تو حُسن کی معراج ہے جو انگلے

آوارہ جھکڑ کھڑکیوں سے گھس گھس کر اس کے شمپو کئے ہوئے بالوں کو اس کے منہ پر بکھیر کر سنسناتے ہوئے ٹھٹے لگاتے کھڑکی سے نکل جاتے تھے اور ٹیلیفون کے کھمبے اور تار کے جھاڑ اٹھ اٹھ کر کھڑکیوں سے اس کی پیشانی پر جھلاہٹ سے سمٹی ہوئی مرمریں سلوٹوں کو دیکھ رہے تھے۔ وہ بار بار رنگدار ناخنوں والی انگلیوں سے اپنی زلفیں چہرے پر سے ہٹاتی جاتی تھی ۔۔۔۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کبھی دھوپ ہے ۔۔۔۔ کبھی چھاؤں ۔۔۔۔ دھوپ چھاؤں . . . . لیکن باہر سے آنے والی ہواؤں اور باہر سے آئے ہوئے سپاہی کو جیسے اس نیم ہندوستانی حسن سے عشق تھا عشق ہمیشہ دلآویز رنگ، نظر کش، چمک دمک، روح کو بالیدہ کرنے والی خوشبوؤں سے ہوتا ہے ۔۔۔۔ اور یہی وجہ ہے کہ عشق غیر انسانی ہے عشق اگر انسانی ہوتا تو ایک جرمن ایک روسی کو نہ مارتا۔ ایک گورا ایک کالے کو غلام نہ بناتا عاشق نہ آریائی نسل سے ہوتا ہے اور نہ دراوڑی نسل کا ۔۔۔ عشق جغرافیائی حدود میں مقید نہ ہوتا ۔۔۔۔ عشق اگر انسانی ہوتا تو ہندوستانی، یہودی اور اور حبشی بھی انسان کہلاتے۔ عشق انسان کو درندگی سکھاتا ہے۔ اگر ہٹلر کو ملک گیری کا عشق نہ ہوتا تو آج یورپ میں انسان نہ مرتا۔ آج یورپ میں انسان مر گیا ہے انسانی کھالوں میں جانور ہی جانور ہیں خاکی وردی پہنے ہوئے سپاہی سپاہی ہیں جو مسکراتے ہوئے اپنے ہی گلے پر چھری پھیر دیتے ہیں ۔۔۔ اور اگر جان بُل کو تجارتی کمپنیوں کا عشق نہ ہوتا تو . . . . . .

فوراً ہی میری نظر سامنے باتھ روم کے دروازے پر چسپاں اشتہار پر

پڑی —— "براہ کرم یہاں فوجی اور سیاسی گفتگو نہ کیجئے"۔
اور میں نے اشوک کے کتبے کی طرح تجارت دہندہ اشتہار کا دل سے احترام کرتے ہوئے سارے خیالات سگریٹ کے گھنے گھنے دھوئیں کے ساتھ باہر اگل دیئے۔ وہ حسینہ ابھی تک گھبرائی ہوئی تھی۔ ہواؤں کے جھکڑ "دھوپ چھاؤں" کھیل رہے تھے۔ اور وہ اسکاچ سپاہی گا رہا تھا۔ میرا دل ہائی لینڈ میں ہے —— مائی ہارٹ……
ایک اسٹیشن پر گاڑی رکی۔ اسکاچ سپاہی نے ایک میوہ فروش لونڈے سے چند سنگترے خریدے۔ پھر گاڑی چلی۔ لڑکی اب ہواؤں کے آوارہ جھکڑوں اور سپاہی کی چور نظروں سے تھک سی گئی تھی۔ اس نے اٹیچی کیس سے ایک سرخ فیتہ نکال کر اپنے بالوں میں اچھی طرح باندھا اور دزدیدہ نظروں سے بچنے کے لئے ایک باسی "اسٹریٹڈ ویکلی" کو دیوار بنائے پڑھ رہی تھی یا تصویریں دیکھ رہی تھی یا صرف اطمینان کی سانسیں لے رہی تھی۔
براہ کرم یہاں سیاسی اور فوجی گفتگو نہ کیجئے۔ صرف سگریٹیں پیتے رہیے گھبرائی ہوئی لڑکیوں کی پیشانی پر جھلاہٹ سے مٹی ہوئی عریں سلوٹیں دیکھتے رہیے۔ ٹائمز آف انڈیا کے کالموں میں اپنے آپ کو بھول جائیے۔ یا پھر گاتے رہیے کہ میرا دل ہائی لینڈ میں ہے۔ میرا دل……
اسکاچ سپاہی نے سنگترے کی رسیلی قاشیں کاٹن ڈائیل کی جاذبی تھالی پر سلیقے سے جما کر مسکراتے ہوئے اس لڑکی کو پیش کیں۔ اور میں گھبرا گیا وہ لڑکی نیم ہندوستانی تھی۔ ہندوستان کا لہو تو اس کی رگوں میں ہے۔ وہ

نیم ہندوستانی حسن تھی۔ اس کی زلفیں اور آنکھیں تو کالی اور چمکیلی ہیں
میرا جی چاہتا تھا کہ وہ لڑکی سنگترے کی قاشیں قبول نہ کرے کیونکہ پھر وہ
مجبور ہو جائے گی۔ اور جب کوئی عورت مجبور ہو جاتی ہے ـــــ اور جب کوئی
سپاہی کسی عورت کو سنگترے کی قاش پیش کرتا ہے۔ تو اس سپاہی کے دماغ
میں ایسٹ انڈیا کمپنی قائم ہو جاتی ہے۔ یعنی اس ہاتھ لے اس ہاتھ دے ـــ
بھلا اس لڑکی کو سنگتروں کی ضرورت ہی کیا تھی۔ جب کہ اس کے
رخسار خود سنگترے تھے۔ اگر وہ یہ سنگترے کی قاش قبول کرے تو وہ خود
بھی سنگترے کی قاش بن جائے گی۔ کیونکہ ایک سپاہی کی نظر میں ایک سنگترے
کی قاش اور ایک نوجوان لڑکی دونوں برابر ہوتے ہیں۔ وہ جس طرح سنگترے
کی قاشوں کا رس چوس چوس کر باہر پھینک رہا ہے بالکل اسی طرح ۔۔۔
حسینہ نے گھبرائی ہوئی، سہمی ہوئی، سمٹی ہوئی، لجائی ہوئی نظروں
سے اسے دیکھتے ہوئے ایک بوکھلائے ہوئے شکریے کے ساتھ وہ قاش
اٹھالی ـــــ اور سپاہی نے مسکراتے ہوئے پوری قاشیں اس کے
السٹریٹڈ ویکلی پر ڈال دیں۔ وہ لڑکی بے حد گھبرا کر میری طرف دیکھنے لگی جیسے
مجھ سے کوئی مدد چاہتی ہو ـــــ مدد! مدد کوئی نیا لفظ نہیں کوئی نیا فعل
نہیں مدد ہی سے تو انسان دھرتی پر زندہ ہے ـــــ اس کو تصور کی
لچک کہئے کہ میں اپنے آپ کو ایک بننے والی کہانی کا ہیرو سمجھنے لگا جس میں
میرا رقیب ایک سپاہی تھا۔
کہانی بننے لگی ـــــ اسکاچ سپاہی اپنی پہلی فتح پر مسرور ہو اب

اس لڑکی کی برتھ پر جا بیٹھا اور میں نے ایسا محسوس کیا جیسے میں ہیرو نہیں ـــــ جیسے کوئی ہندوستانی ہیرو نہیں۔ ہیرو تو ہائی لینڈ میں پیدا ہوتے ہیں اور ہائی لینڈ سے آتے ہیں۔ میں تو رقیب ہوں۔ اور رقیب عموماً روسیاہ ہوتے ہیں۔ روسیاہ یعنی خالص ہندوستانی چہرہ ـــــ وہ سپاہی تو ٹماٹر کی طرح سُرخ تھا۔ وہ سُرخ رو تھا۔ ہیرو ہمیشہ سُرخ رو ہوتے ہیں ہائی لینڈ میں پیدا ہوتے ہیں اور ہائی لینڈ سے آتے ہیں

جونہی وہ سپاہی اس لڑکی کی برتھ پر جا بیٹھا۔ لڑکی سکڑ کر کونے میں دبک گئی اور اپنے اور اس سپاہی کے درمیان حدبندی (جیسے جغرافیائی حدبندی ہوتی ہے) کرنے کے لئے اپنا اٹاچی کیس وہاں رکھدیا۔ اور پھر انجان نظروں سے باہر دیکھنے لگی۔ میں مسرت سے مسکرانے لگا۔ یہ ہندوستانی لہو کی غیرت ہے۔ یہ اٹاچی کیس کی حدبندی عصمت کا حصار ہے واہ لڑکی!! سپاہی دوسرے سنگترے کی قاشوں کے لئے اس کی خوشامدیں کر رہا تھا اور وہ پھیکی مسکراہٹوں سے باربار "نو تھینکس نو تھینکس" کہے جا رہی تھی اب میں ہیرو تھا۔ میں نے اپنے رقیب کو زک دینے کے لئے اٹھ کر اس لڑکی سے وہ کتاب مانگی۔ جو اس کی رانوں پر بڑی دیر سے منہ اوندھائے پڑی تھی۔ لڑکی نے مسکراتے ہوئے اس کتاب کی لمبی تعریف کرتے ہوئے وہ کتاب اس بے تکلفی سے مجھے دی۔ جیسے اس کی میری برسوں کی دوستی ہے ـــــ جیسے وہ میری ازلی محبوبہ ہے۔ میں بڑی دیر تک اس کے برتھ کے پاس کھڑا ہنس ہنس کر اس سے باتیں کرتا رہا۔ اور میرا رقیب ایسی غضیلی

نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ جیسے اگر وہ پارسی بورڑ داگواہ نہ ہوتا۔ تو وہ مجھے کمپارٹمنٹ سے باہر ڈھکیل دیتا ——— اس لڑکی کی مسکراہٹ میں گھلی ہوئی میٹھی میٹھی باتیں سن سن کر مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ہندوستان نے اسکاٹ لینڈ کو شکست دے دی ہے۔

اب وہ منہ میں ایک قاش ڈالے گنگنا رہا تھا۔ میرا دل ہائی لینڈ میں ہے۔ میرا دل . . . . اس ناکامی کے بعد بیچارے کو ہائی لینڈ بہت یاد آرہا تھا۔ ہائی لینڈ ——— جہاں کی لڑکیاں کسی کے پیش کئے ہوئے سنگترے کی قاشوں کو سکڑی ہوئی مسکراہٹوں سے واپس نہیں کرتیں۔ بلکہ ایک سنگترے کی قاش کے عوض دوسرے سنگترے کی قاش ——— قاش جیسے گال ——— اب یہ سپاہی کی سادہ لوحی ہی تو تھی کہ وہ ہندوستان میں ہائی لینڈ دیکھنا چاہتا تھا۔ اور جب ایک لڑکی نے اسے مایوس کر دیا تو چیخ رہا تھا کہ میرا دل ہائی لینڈ میں ہے!

میں اس وقت۔ کچھ ایسا مسرور تھا کہ پہلے درجے کے آداب اخلاق کا لحاظ کئے بغیر، اپنی پرولتاری حیثیت کو بھول کر، تعارف کے تکلف سے بے نیاز ہو کر میں نے اس پارسی بورڑ دا کو مخاطب کیا۔

"ادھر کچھ دنوں سے ہندوستانی کچھ ایسا جاگ اٹھے ہیں کہ ان تمام باہر والوں کو جو ہندوستان آکر اپنے اصلی ہم وطنوں کو بھول گئے تھے۔ اب بات بات پر اپنا وطن یاد آنے لگا ہے"۔

پارسی بورژوا مسکرانے لگا۔ اسکاچ سپاہی نے اپنا گیت ایکدم بند کر دیا۔ اس کا چہرہ اب تمتمانے لگا تھا۔ لیکن میرے جملے کی تعریف میں لڑکی کے مسکراتے ہوئے ہونٹوں کے دلآویز کناروں میں وہ اپنا غصہ بھول گیا۔ اور لڑکی تک ایک ٹیڑھے راستے سے پہنچنے کے لئے اس نے میرے جملے کا جواب دیا۔

"وہ سچ کہتا ہے ——— اس جنگ کے آغاز سے اب تک میں کئی ملکوں کی سیر کر چکا ہوں۔ فرانس گیا تھا۔ اٹلی میں رہا یونان میں تھا۔ سارا شمالی افریقہ دیکھ ڈالا مگر مجھے ہالینڈ کہیں یاد نہ آیا۔ وہاں ہمیں وہ سب نعمتیں مل جاتی تھیں جو ہالینڈ میں ملتی ہیں۔ لیکن ہندوستان میں ہالینڈ بہت یاد آتا ہے۔"

مجھے اس کی اس متعصب ذہنیت پر بڑا غصہ آیا۔ ہندوستان میں ہالینڈ کا یاد آنا ایک قومی و نسلی تعلی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ سچ پوچھیے تو ان کو ہالینڈ میں ہندوستان بہت یاد آتا ہے۔ ہالینڈ جا کر وہ ہندوستان کی ایک ایک چیز کو یاد کرتے ہیں۔ یہاں کی سونے اور چاندی کی کانوں کو .... ہیروں کی معدنوں کو، خوبصورت محلوں کو اور یہاں کی عورتوں کی آنکھوں اور زلفوں کو آہیں بھر بھر کے یاد کرتے ہیں۔

وہ لڑکی سے کہہ رہا تھا۔

اگرچہ کہ ہندوستان بہت خوبصورت ہے۔ مگر یہاں

تہذیب نہیں۔"
میں نے جھٹ سے جواب دیا۔
"تہذیب کے لئے آزادی کی سخت ضرورت ہے۔"
وہ میری اس مداخلت سے برافروختہ ضرور ہوا۔ لیکن لڑکی کی موجودگی میں وہ کچھ ایسا موم ہو رہا تھا کہ اپنی خفگی چھپا کر بولا۔
"نہیں ——— یہ کوئی ضروری نہیں۔ تہذیب کے لئے تعلیم کی سخت ضرورت ہے میں نے ہندوستان میں جتنے کالج اور یونیورسٹیاں دیکھیں۔ اتنی اسکاٹ لینڈ میں بھی نہیں ہیں مگر پھر بھی ہندوستانی جاہل ہیں۔ یہ کیا بات ہے؟"
پھر میں نے دخل دیا۔
"یہاں کی تعلیم ہی کچھ ایسی ہے کہ پڑھ لکھ کر بھی ہندوستانی جاہل ہی رہتے ہیں۔ اب مجھی کو دیکھو۔ میں ایک ایسی یونیورسٹی کا گریجوئٹ ہوں۔ جس کا ذریعہ تعلیم انگریزی ہے۔ لیکن میرے جملوں کو غور سے سنو تو گرامر کے لحاظ سے ایک جملہ بھی صحیح نہیں۔"
اس نے کہا۔
یہ تمہارا قصور ہے ———!
اب میرا موڈ جوش کھا رہا تھا۔
"یہ میرا قصور کبھی نہیں۔ قصور ان پروفیسروں کا ہے جو

یورپ کے بادشاہوں، حکومتوں، یورپی تہذیب و تمدن یورپ کی عورتوں، یورپ کے جانوروں اور یورپ کے پرندوں پر لکھے ہوئے مضامین اور نظموں کا نصاب ہندوستان کے لئے مرتب کرتے ہیں۔ اور پھر آکسفورڈ اور کیمبرج کے چھاپے خانوں میں چھاپ کر ہندوستان بھیجتے ہیں۔"

وہ اب چڑ رہا تھا۔ بولا۔

"تم بڑے بے باک ہو!"

میں نے جواب دیا۔

"میں کیا —— ہر ہندوستانی بیباک ہے۔ لیکن اس کو فرسٹ کلاس میں سفر کرنے کا بہت کم موقع ملتا ہے۔ —— تم ہی کسی تھرڈ کلاس کمپارٹمنٹ میں جا بیٹھو تو تمھیں معلوم ہو جائے گا کہ ہر ہندوستانی بیباک ہے۔ میں تو بہت ہی دُبلا پتلا ہوں۔ میری انگریزی بہت کمزور تھی اسی لئے میں شام کو فٹ بال کھیلنے کے بجائے بیکن کے مضامین رٹا کرتا تھا۔ لیکن تھرڈ کلاس میں تم کو ایسے ہندوستانی ملیں گے جو بیکن کے مضامین رٹنے کے بجائے فٹ بال کھیلتے رہے —— وہ تو مجھ سے بھی زیادہ بیباک ہیں۔"

اب وہ میری باتوں سے متاثر ہو رہا تھا۔ پوچھا۔

"تم ہندو اور مسلمان متحد کیوں نہیں ہو جاتے؟"

میں نے جواب دینے کے بجائے اس سے ہی سوال کیا۔

"تم ہی بتاؤ ہم ہندو اور مسلمان متحد کیوں نہیں ہو جاتے؟"

وہ سٹپٹایا ——— اور بات ہی بدل دی۔

"ہندوستان کی اخلاقی حالت بہت خراب ہے۔ اتنے بہت سے مذاہب کی سرزمین ہونے کے باوجود یہاں سیاہ کاریاں بہت ہوتی ہیں"

میں نے اس سے جھوٹ کہا۔

میں جب آکسفورڈ میں تھا تو اکثر لندن جایا کرتا تھا۔

میں نے وہاں . . . . . .

بڑا ہوشیار اور زود فہم تھا وہ سپاہی پھر بات کاٹی۔

"میں دو مہینے تک فوجی تربیت کے سلسلے میں سکندر آباد میں تھا۔ وہاں میں نے آدھی راتوں کو سڑکوں پر آٹھ آٹھ دس دس سالہ لڑکوں کو دیکھا ہے جو مجھے اور میری طرح کے سپاہیوں کو گھیر گھیر کر پوچھتے تھے۔

"یو وانٹ وومن صاب ——— آپ کو عورت چاہئے صاحب"

اس جملے نے میری چلتی ہوئی زبان جیسے روک لی۔ میرے ابلتے ہوئے خون کو رگوں میں دبا دیا۔ اور ندامت چھپانے کی خاطر ایک سگریٹ جلائی وہ سچ کہتا تھا۔ کل ہی میں نے ایک بوڑھے دلال کو چھوٹے بچوں کی

ایک ٹولی کو یہ جملہ —— یو وانٹ دومن صاحب —— رٹاتے سُنا ہے۔ وہ کہے جا رہا تھا۔

"میں لکھنؤ کی ایک بیگم سے مل چکا ہوں۔ وہ اودھ کے شاہی خاندان سے تھی۔"

میری رگوں میں سارا لہو کھول گیا۔

تم کو غلط فہمی ہوئی —— یہاں کی ہر عورت بیگم ہوتی ہے۔ بیگم صرف شاہی خاندان کی عورتوں ہی کو نہیں کہتے۔ بلکہ یہاں کی طوائف بھی بیگم ہوتی ہے۔ یہ صریح جھوٹ ہے کہ لکھنؤ کی بیگم تم جس سے مل چکے ہو۔ اودھ کے شاہی خاندان کی ملکہ تھی —— وہ محض تمہاری جیب سے زیادہ دام اگلوانے کے لئے اودھ کے شاہی خاندان کی ملکہ بن گئی تھی مجھے یقین ہے کہ وہ ایک طوائف تھی۔ یہاں کی طوائفیں بہت جھوٹ بولتی ہیں —— یوں تو ہر ملک کی طوائفیں جھوٹ بولتی ہیں لیکن ہندوستان کی طوائفوں کو مقابلتاً بہت کم دام ملتے ہیں اسی لئے وہ تمام ملکوں کی طوائفوں سے زیادہ جھوٹ بولتی ہیں —— میں جب علی گڈھ میں پڑھتا تھا تو ایک بھکارن نے مجھ سے یہی کہا تھا کہ وہ بھی ایک بیگم ہے۔ اور مغلیہ شاہی خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ حالاں کہ وہ ہمارے وائس چانسلر کے شوفر کی لڑکی تھی۔ جس کو کوئی خانساماں

اُڑا لے گیا تھا۔"

وہ اپنی بات منوانے پر مصر تھا۔ کہنے لگا۔

"پھر بھی ——— ہندوستان میں عورت بہت سستی ہے
میں نے ایک روپے میں دو بیگموں کو اپنے سینے سے
لگایا ہے۔"

میں اس جھوٹ کو سہہ نہ سکا۔ اور پھر جھوٹ بولا۔

میں جب آکسفورڈ میں تھا ———"

وہ مجھے بھانپ گیا۔ اور جلدی جلدی بولنے لگا۔

اس جنگ کے بعد ہندوستان کی حالت اچھی ہو جائے گی
اس جنگ سے ہندوستان دن بدن صنعتی ہوتا جا رہا ہے
اور ہندوستان خود کفیل ہو جائے گا۔"

میں نے ہندوستان کی تاریخ پڑھی ہے۔ میں کب مانتا؟
ہندوستان اس وقت سے ایک صنعتی ملک ہے جب کہ
دنیا جانتی بھی نہ تھی کہ صنعت کسے کہتے ہیں۔ پندرھویں
سولھویں صدی میں ہندوستان کے ململ، ریشم، اطلس و کمخواب
کے لئے تمہاری اسکاٹ لینڈ کی شہزادیاں تک ترپتی تھیں۔
ہندوستان کے ظروف یورپ کے شہنشاہوں کے دسترخوانوں
پر تھے۔ ہندوستان کے سلک کا ذکر ملٹن اور ولیم مارس
تک نے اپنی نظموں میں کیا ہے۔"

وہ اب چکرا رہا تھا۔

تم طالب علم ہو ——؟

میں نے گہری سانس میں جواب دیا۔

کاش میں طالب علم نہ ہوتا —— مجھے افسوس ہے کہ میں اس شہرۂ آفاق ململ ریشم اطلس و کمخواب کا جولاہا کیوں نہیں —— میں، دنیا کی نظریں خیرہ کرنے والے سونے چاندی، ہیرے، جواہرات کے زیوروں کا سنار کیوں نہیں —— میں تاج محل جیسی عمارتوں کا معمار کیوں نہیں۔ میں صرف طالب علم کیوں ہوں —— مجھے اسی کا دکھ ہے۔''

. . . .

حیدر آباد کے نواحی اسٹیشن شروع ہو چکے تھے اور میرا جی چاہ رہا تھا کہ میرے دماغ دل، روح میں جو کچھ بھی ہے سب اگل دوں، تاکہ یہ سپاہی جب اپنے وطن واپس ہو تو اسکاٹ لینڈ میں وہ ہندوستان تعمیر نہ کرے۔ جہاں کے شاہی خاندانوں کی بیگمات روپے میں دو کے حساب سے بکتی ہیں۔ جہاں کا بچہ بچہ "یو وانٹ دو من صاب" چیخ چیخ کر اپنی ماؤں اور بہنوں کی عصمتیں بیچ رہا ہے —— جہاں تہذیب و تمدن نہیں۔ جہاں کالجوں اور یونیورسٹیوں کے باوجود جہالت ہے۔ اور جو اس جنگ کی بدولت پہلی بار صنعت و حرفت کے نام سے روشناس ہو رہا ہے ——

گاڑی نام پلی اسٹیشن پر رکی۔ اس لڑکی نے ایسی بے رُخی سے اپنی کہانی

مجھ سے مانگی جیسے وہ مجھے جانتی ہی نہیں۔ کہانی ختم ہو چکی تھی اب ہیروئن کو ہیرو کی ضرورت ہی کیا تھی ہیروئن کو تو صرف اسی وقت ہیرو کی ضرورت ہوتی ہے جب رقیب بیچ میں ہو۔

میں نے مسکراتے ہوئے اپنا سامان پلیٹ فارم پر اتروا دیا۔ اور جب گاڑی سکندر آباد کی طرف دھیمے دھیمے رینگنے لگی تو میں نے اپنے اسکاچ رقیب سے کہا۔

دوست ـــــ تم کہہ رہے تھے کہ ہندوستان میں عورت بہت سستی ہے۔ ایک روپیہ میں دو بیگمیں ـــــ لیکن پورے آٹھ گھنٹے سے تم اس لڑکی پر کوشش صرف کر رہے تھے اور ناکام رہے ـــــ یہ لڑکی کھاتی پیتی ہے۔ اُن روپے میں دو بیگموں کی طرح بھوکی اور ننگی نہیں ـــــ جو اودھ اور مغلیہ شاہی خاندانوں کا نام لے کر تمہاری جیبوں سے زیادہ سے زیادہ دام اگلواتی ہیں"

وہ اپنی ناکامی پر چڑا ہوا تھا۔ بڑے غصے سے بولا۔

"شٹ اپ ـــــ"

میں زور سے ہنس پڑا۔ اور گنگناتے ہوئے اسٹیشن سے باہر نکلا ـــــ میرا دل ہائی لینڈ میں ہے۔ میرا دل ......

ہوٹل کا ایک کمرہ

میں اکثر سوچا کرتا ہوں کہ اس بوسیدہ چار دیواری سے نہ جانے کتنے بڑے آدمی کتنے کلرک اور کتنے بے روزگار نکلے ہوں گے۔؟ اب میں یہاں رہتا ہوں۔ نہ جانے میں آگے کیا بنوں گا؟ بڑا آدمی، کلرک یا پھر بے روزگار ——— ؟ مگر مجھے بڑا آدمی بننا ہے۔ گھر سے ساٹھ روپیے مہینہ اسی لیے آتے ہیں کہ کل میں نوسو ساٹھ روپیے کمانے لگ جاؤں گھرانے کا نام روشن ہو۔ دنیا میں نام ہی تو سب کچھ ہے۔ باقی سب مایا۔ باقی سب قوس قزح کے دل فریب رنگ ——— اگر میں بڑا آدمی بن گیا تو سب کہہ اٹھیں گے کہ واقعی میں بہت خوش قسمت ہوں۔ چمکتا ہوا چاند ہوں۔ کھلا ہوا پھول ہوں ——— اور اگر کلرک یا بیروزگار تو سب کا خیال ہو گا کہ یہ لڑکا پیدائشی منحوس ہے۔ اور سب میری پیدائش کے دن کو اس دن سے ملا دیں گے جس دن دنیا میں جنگِ عظیم کا آغاز ہوا یا جس دن شہر میں زوروں کا پلیگ پھوٹ پڑا تھا۔ اور اس طرح سب قسمت کے فیصلے پر خوب خوب بحث کریں گے۔ مجبور انسان اور کر ہی کیا سکتے ہیں۔ قدرت نے یہ لمبی زبان حلق میں اسی لئے تو جڑ دی ہے کہ جب بس میں کچھ نہ ہو تو خوب

خوب بولا کرو پوری قوت سے بولا کرو کہ خوش قسمتی ——— بد قسمتی،
انسان بھیک مانگتا ہے ہندوستان میں بڑے آدمی پیدا
نہیں ہوتے ——— خدا بھی رنگ و نسل کا حامی ہے
وغیرہ وغیرہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

کل میرا کمرہ رہا تھا کہ اس کمرے میں چار سال سے جتنے بھی
لڑکے رہنے آئے وہ کسی نہ کسی مصیبت کا شکار ہوتے رہے۔
مصیبت بڑی چالاک شکاری ہے۔ ارباب خاں امتحان میں فیل
ہو گیا۔ رحیم بیگ کو زیادہ پڑھتے رہنے کی وجہ سے دق ہو گئی۔
مشیر حسین کا انتقال ہو گیا۔ رفیق کو کالج سے نکال دیا گیا۔ اور اب
میں ——— میرا کیا ہوگا ——— ؟

میں نے گھبرا کر کمرے کی چار دیواری پر نظر ڈالی۔ ایک دیوار
پر ارباب خاں بستر باندھتا نظر آیا۔ دوسری پر رحیم بیگ پر سوکھی
کھانسی کے دورے پڑ رہے تھے۔ تیسری پر مشیر حسین کا جنازہ
جا رہا تھا اور چوتھی دیوار پر رفیق دھاڑیں مار مار کر روتا نظر آیا
——— ارباب خاں بڑا آدمی بن نہ سکا رحیم بیگ پروفیسر
نہ بن سکا۔ رفیق کلرک نہ بن سکا۔ مشیر حسین کچھ بھی نہ بن سکا۔ اب میری
باری ہے۔

مجھے اپنے کمرے کی چھت نیچی ہوتی نظر آئی۔ اور ایک وحشت
سے دل گھبرانے لگا۔ میں چاہتا تھا کہ ——— میری نظر دیوار پر

پنسل سے لکھے ہوئے شعر پر پڑی ہے

اے شمع صبح ہوتی ہے روتی ہے کس لئے

تھوڑی سی رہ گئی ہے اسے بھی گزار دے

یہ شاید زندگی سے مایوس مشیر حسین نے لکھا تھا۔ مگر اس کو کس صبح کی امید تھی۔ موت تو زندگی کی شام ہے۔

کتنا پراسرار ہے یہ کمرہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے الف لیلیٰ کی بہت سی کہانیاں اس کمرے سے متعلق ہیں۔ اور میں ایک دوسری شہزادہ جو باوجود منع کرنے کے اس کمرے میں چلا آیا۔ اور ابھی ابھی کوئی دیو یا جن میری خدمت میں حاضر ہونے والا ہے ——

میں یہی سوچ رہا تھا کہ اچانک سُرخ پگڑی والا دیو کمرے میں آدھمکا —— ڈر کر چیخنے کے بجائے میرے ہونٹوں میں ایک ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔ گھر سے ساٹھ روپے کا منی آرڈر آیا تھا۔ سُرخ پگڑی والے کے ساتھ دو تین دوست بھی آدھمکے۔ میرے ہاتھوں میں ہرے ہرے نوٹوں کی گڈی دیکھ کر آوازیں بلند ہوئیں۔

"یار۔ آج دلّی چلیں۔ شگفتہ جان سے ملے زمانہ ہوگیا۔"

"یار۔ آج چترلیکھا دیکھیں گے۔ مہتاب نے ایک رشی کا تقدس توڑا ہے۔"

"یار۔ آج بڑھیا سگریٹ اڑے گی۔"

"یار۔ آج لیلا ڈیسائی کا روبی ٹاکیز میں ڈانس دیکھو گے"۔

میں نے اس وقت کوئی جواب نہیں دیا۔ کیونکہ پیسہ میں تو شراب سے زیادہ نشہ ہوتا ہے۔ فرید کا ٹائپ کچھ کچھ کمیونسٹ ہے۔ اس نے ہمیں ڈانٹ کر کہا۔

"کیا بکواس ہے یہ ——— کیا ہمارے والدین اسی لئے ہمیں پیسے بھیجتے ہیں کہ ہم شگفتہ جان سے ملنے جائیں۔ کیا چتر لیکھا دیکھے بغیر عورت کو سمجھا ہی نہیں جا سکتا ——— اور کیا لیلا ڈیسائی کا ڈانس دیکھے بغیر زندہ رہنا ناممکن ہو جائے گا ———"

وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا۔ مگر ہم سب قہقہے لگانے لگے۔ اور میرا قہقہہ تو تمام قہقہوں سے زیادہ دیر تک گونجتا رہا۔

فرید جھنجلا کر اُٹھ کر چلا گیا۔ اور ہم نے بیرے سے ساری کیفے ڈی جمیل " کمرے پر منگوا لی۔ خوب پیٹ بھر کر چاندی کے سکوں کو سگریٹ کا دھواں بنانے لگے۔ اس دھوئیں کی ہلکی نیلی سطح پر ہمیں لیلا ڈیسائی انچل سنبھالے، پائیل باندھے، دھیرے دھیرے پاؤں دابے اپنے پیا سے ملنے جاتی نظر آئی ——— اور پھر شگفتہ جان کی کاکلیں جیسے ہمارے سب کے شانوں پر بکھر گئیں۔ رضوان نے مخمور لہجے میں کہا۔

"دنیا میں صرف ایک ہی عورت پیدا ہوئی ہے ———
اور وہ میری ڈارلنگ شگفتہ جان ہے"

جونیر اور نو عمر سبطین نے جو عورت کے بارے میں بہت

دھندلے معلومات رکھتا تھا۔ بڑے پرشوق لہجے میں کہا۔
"ایک مرتبہ مجھے بھی ساتھ لے چلو یار ـــــــ مجھے تو شگفتہ جان کا نام سنتے سنتے اس سے دلچسپی ہو چلی ہے۔"
جمیل نے ڈانٹا۔
تم ابھی بچے ہو ـــــــ یہ سیٹنگ لگانے کا شوق تمھیں کب سے پیدا ہوا۔"
حالانکہ جمیل سبطین سے شاید ہی ایک سال کا بڑا ہو۔ مگر چونکہ اس نے "تنہائی میں چھپ چھپ کر پڑھنے والی" بہت سی کتابیں پڑھ لی تھیں۔ اس لیے عورت کی نفسیات کے معاملے میں اپنے آپ کو سعادت حسن منٹو سے بھی بلند سمجھتا تھا۔
اچانک ایک ایسی آواز آئی جو شگفتہ جان کی آواز سے زیادہ رسیلی تھی۔
"ایک پیسہ دیدے رے بابا ـــــــ موہے بھوک لگی ہے رے۔"
آواز میں جوانی گا رہی تھی۔ ہم سب کے سر کھڑکی میں جمع ہو گئے ایک بھکارن تھی۔ جس کے ساتھ دو کالے مریل بچے اور ایک چھوٹا سا پلا جو اس کی چھاتی سے لگا ہوا تھا۔ رضوان نے کہا۔
"عورت نہیں ہے بلکہ چوسا ہوا پیپرمنٹ ہے۔"

جمیل نے کہا۔

"ہلو مائی ڈیر شگفتہ جان ——— تم آگئیں"

بھکارن نے گڑگڑا کر کہا۔

"ایک پیسہ بابا ——— مورے بچے بھوکے ہیں"

جمیل نے کہا ——— "ہم بھی تو بھوکے ہیں میری جان"

مجھے جمیل کی یہ حرکت ناگوار گزری۔ مجھے اس عورت میں فاقہ زدہ ہندوستان جھانکتا نظر آرہا تھا۔ مجھے اس پر رحم آگیا اور میں نے پوچھا۔

"تم بھیک کیوں مانگتی ہو ——— کیا تمھارا شوہر نہیں ہے"

"مر گیا ہے۔ سرکار"

جمیل نے پھر بد تمیزی کی۔

"کب مرا ڈارلنگ؟"

"دو برس پہلے ———"

مجھے یکا یکی غصہ آگیا۔

"اور یہ دودھ پیتا بچہ ———؟"

بھکارن مسکرائی اور لجا کر کہنے لگی۔

"یہ ——— یہ تو ایک ننھی سی جان ہے صاب"

میں نے ڈانٹ کر کہا۔

"بے شرم بھاگ جا یہاں سے چڑیل ———!"

میں نے ایک اکنیّ اس کی طرف پھینکی۔ اس کی آنکھیں زمین میں گڑی ہوئی تھیں۔ اور وہ اس ننھی سی جان کو اپنی چھاتی سے بھینچے جا رہی تھی۔

یہ کیسی غریبی ہے۔ یہ غریب نہ صرف کمینے ہوتے ہیں بلکہ ذلیل بھی! عزت بیچتے ہیں۔ روٹی کھاتے ہیں۔ بھیک مانگتے ہیں۔ بچے پیدا کرتے ہیں۔ گالیاں سنتے ہیں اور مسکرا دیتے ہیں۔

اس کے بعد سب دوست میرے کمرے سے چلے گئے۔ کمرے میں بڑھیا سگریٹ کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی ——— اور مجھے کچھ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے شگفتہ جان اور ریلا ڈیسائی گلے مِل رہی ہیں۔ اور وہ بھکارن معنی خیز انداز میں میری طرف دیکھ کر مسکرا رہی ہے ——— میں نے میز پر سے نوٹوں کی گڈی اٹھالی ——— ایک گھنٹے میں میں نے ایک دم دس روپے اڑا دیئے تھے۔ صرف دھوئیں پر ——— صرف خوابوں پر۔ مجھے ایسا معلوم ہونے لگا جیسے میں اب تک کمرے میں نہیں تھا بلکہ کسی میخانے کی مدہوش فضا میں بے ہوش تھا ——— اور اب تو میری نظر میں ہوسٹل کی زندگی اور میخانے کی رات کا مطلب ایک ہی ہے ——— جب خمار اُترے گا تو توبہ کرنے سے بھی کچھ نہ ہوگا۔ پھر وہی پُرانی چار دیواری اور بوسیدہ چھت ہوگی ———

کتنا پر اسرار ہے یہ کمرہ . . . . . . ہم یہاں اس میں

رہ کر تعلیم حاصل کرنے نہیں آئے ہیں بلکہ زندگی کا جوا کھیلنے آئے ہیں ایک اچھی زندگی یا بری زندگی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کلرک یا بڑے آدمی ——— مجھے بڑا آدمی بننا ہے۔ اور بڑے آدمی ہمیشہ پراسرار حالتوں سے نکل کر بڑے بنتے ہیں۔ خس وخاشاک سے جھونپڑیوں سے، یتیم خانوں سے ہوسٹلوں کے پراسرار کمروں سے اسی لئے میں نے تاریخ ہند اٹھائی اور پڑھنا شروع کر دیا۔

——— ایک لق ودق صحرا میں ایک بے یار ومددگار حمیدہ بانو بیگم کی گود میں ایک گل گوتھنا سا بچہ ہمکنے لگا۔ ہمایوں نے اپنی بیوی کو کچھ ایسی نظروں سے دیکھا۔ جیسے وہ اس بچے کو بڑا منحوس سمجھتا ہے مگر۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مگر وہی بچہ شہنشاہ جلال الدین اکبر بن بیٹھا۔" میں نے ایک نوزائیدہ امید سے جھرجھری لی اور پھر پڑھنے لگا۔" اکبر کے زمانے میں ہندوستان جنت نشان تھا۔ لوگ خوش حال تھے کوئی بھیک بھی نہیں مانگتا تھا۔"

بھیک ——— بھیک۔ میں بھٹکنے لگا۔ بھکارن میرے کانوں میں چیخنے لگی۔

"ایک پیسہ دیدے رے بابا ——— موہے بھوک
لگ رہی ہے رے۔"

منحوس بھکارن اکبر کے زمانے میں پیدا نہ ہوئی۔ اب پیدا ہوئی ہے جب کہ ہندوستان جہنم نشان بن گیا ہے۔ لوگ بدحال

ہیں۔ ملک میں بے شمار دولت ہے مگر ملک والے بھوکے اور ننگے ہیں۔

"ایک پیسہ دیدے رے بابا ——— موہے بھوک لگ رہی ہے"

کیا معلوم اس پُرانی چار دیواری اور اس بوسیدہ چھت سے نکل کر میں بھی یہی پکار اُٹھوں کہ مجھے بھوک لگ رہی ہے اِسے ——— اور پھر مجھے بھی کوئی ڈانٹ دے گا۔

"بھاگ جا شیطان یہاں سے"

چڑیل اور شیطان ——— ہندوستان میں اب بڑے آدمی پیدا نہ ہوں گے۔

میرا ایک دوست نورج میرے کمرے میں گھس آیا۔ یہ پارسال ام۔ اے پاس کر گیا ہے۔ انگریزی ادب پر پورا پورا حاوی ہے۔ اچھے اچھے پروفیسر اس کے سامنے بغلیں جھانکتے ہیں۔ مگر کیا ہے وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ ——— ام۔ اے تک پہنچتے پہنچتے تئیس برس گزر گئے۔ صحت جواب دے گئی ہے۔ اور سوال درپیش یہ کہ وہ بے روزگار ہے۔ محنت مزدوری تک کے قابل نہیں۔ وہ نہ بھیک مانگ سکتا ہے اور نہ زندگی میں کچھ کر سکتا ہے۔ وہ تو مر بھی چکا۔ کیونکہ سانس کی آمد و رفت ہی تو زندگی نہیں۔ اس نے کتابوں کو حقارت سے میز پر پھینکتے ہوئے کہا۔

ان کتابوں نے تو زندگی کی ساری اٹھان کا ستیاناس کر دیا ہے

کیوں ـــــ مگر اب تو آرام سے گزرتی ہے۔ اس پرانی چار دیواری اور بوسیدہ چھت کے نیچے پناہ لیتے ہیں۔ گھر سے ساٹھ روپے مہینہ آتے ہیں۔ کل پناہ لینے کے لئے نہ یہ چار دیواری ہوگی نہ یہ بوسیدہ چھت ـــــ اور نہ گھر کے ساٹھ روپے اور چاروں طرف اندھیری رات ـــــ"

میں نے یہ جملہ اس کی تقریر کے آخر میں چپکا دیا۔

"ایک پیسہ دیدے رے بابا ـــــ موہے بھوک لگی ہے اِے"

ایک مالدار ملک میں بھکاری رہتے ہیں اور شاہی تاج میں ہیرے جگمگاتے ہیں۔ کہیں سورج غروب نہیں ہوتا اور کہیں بھیانک رات ہی رات۔

"چُپ چُپ چُپ چُپ"

ایک چھپکلی دیوار پر سے بول پڑی۔ دو مکھیاں آپس میں لڑ رہی تھیں ایک مچھر میرے جسم کا خون چوس رہا تھا ـــــ نوح نے کہا۔

"کیسا ملک ہے یہ۔ ہندو مسلمان آپس میں لڑ رہے ہیں بڑا چھوٹے کا خون پی رہا ہے۔ مفلسی ہندوستان کو کھا رہی ہے"

"چُپ چُپ چُپ چُپ"

شگفتہ جان کے رسیا رضوان خوش خوش چلے آئے۔

"یار ——— مٹھائی کھلاؤ تو ایک بات کہوں۔ بیچ کی دوکان پر ایک لڑکی چاکولیٹ خرید رہی تھی۔ حالانکہ وہ خود چاکولیٹ سے زیادہ میٹھی تھی۔ اس کے بال بڑے لمبے اور چمکیلے تھے اور آنکھوں میں ستارے تھے۔ اور ......

"اور اس کا منہ بندریا کی طرح سرخ تھا۔" میں نے چڑ کر کہا۔ یہ سب یہاں کیوں۔ اس لڑکی کے بال چمکیلے تھے۔ اس کی آنکھوں میں ستارے تھے۔ مجھے سب سے نفرت ہے۔ مجھے صرف پیسے سے محبت ہے میں چاندی اور سونے کے خواب دیکھنا چاہتا ہوں۔ جن سے خوبصورت اور چمکیلے بالوں والی لڑکیا ستاروں کی طرح چمکدار اور آنکھوں والی لڑکیاں اور پھر یہ ساری دنیا خریدی جا سکتی ہے۔

"چُپ چُپ چُپ"

ہم سب چھپکلی کو دیکھنے لگے۔

کمرے میں شام کا اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ مکھیاں اور مچھر بھنبھنا رہے تھے۔ دیوار پر چھوٹے چھوٹے کیڑے رینگ رہے تھے۔

مستقبل سے مایوس نوح نے کہا۔

"عجیب کمرہ ہے یہ ——— چھپکلیاں۔ مچھر، مکھیاں کیڑے، مکڑیاں اور ہم انسان ؟"

میرے جی میں آئی کہ اس کا کندھا جھنجھوڑ کر پوچھ بیٹھوں۔
کیوں صاحب ـــــــــ کیا یہ جھوٹ ہے کہ ہم چھپکلیوں۔ مچھروں مکھیوں سے زیادہ ذلیل زندگی نہیں گزار رہے ہیں۔ اس کمرے میں ارباب خاں فیل ہو گیا اور کسی چھوٹے سے دفتر میں معمولی کلرک بن گیا۔ رحیم بیگ دق کے کسی سینوٹوریم میں پڑا کٹیس کی جوانمرگی کو یاد کر رہا ہے۔ یہیں مشیر حسین نے جان دی۔ یہاں سے رفیق نکال دیا گیا۔ اور اب میں ـــــــــ؟
میں کچھ ہی دنوں میں پاگل ہو جاؤں گا۔ یہ کمرہ واقعی بڑا پُر اسرار ہے۔ یہ حشرات الارض اور ہم انسان......؟ لیکن کیسے مزے کی بات ہے کہ یہاں کوئی بھی ایک دوسرے پر فوقیت نہیں رکھتا۔

یہ پُرانی چار دیواری اور بوسیدہ چھت!

ـــــــ + ـــــــ

فاصلہ

میری آنکھوں کے پیالے نیند سے بھرے جا رہے تھے۔ لیکن شہاب دندناتا ہوا کمرے میں گھسا اور میری قمیص پکڑ کر اس بدتمیزی سے مجھے پلنگ پر سے اُٹھا دیا کہ ساری نیند آنکھوں سے چھلک کر گر گئی طبیعت اتنی جھلا گئی کہ جی چاہتا تھا کہ اس کے پھولے پھولے گالوں پر ایک زناٹے کا تھپڑ لگاؤں۔ مگر اس کے چہرے پر تو جیسے یتیمی برستی ہے۔ بسورتے ہوئے وہ کہنے لگا۔

"یار ــــــ میری مدد کرو ــــــ واللہ میں مر جاؤں گا۔"

ایک لمبی جمائی لیتا ہوا میں پلنگ سے اُٹھ کھڑا ہوا اور انگڑائی توڑتے ہوئے شہاب کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ ہونٹوں پر آپ ہی آپ مسکراہٹ آ گئی۔ واہ! کیا مزیدار بات کہی ہے۔ ایک مرنے والا دوسرے مرنے والے کے آگے گڑگڑا رہا ہے کہ مجھے موت کے منہ سے بچاؤ۔ ایک مجبور دوسرے مجبور سے التجا کر رہا ہے کہ میری مدد کرو بھلا میں بھی کوئی خدا یا فرنگی ہوں کہ کسی کی موت و زیست اور مدد میرے قبضہ و اختیار میں ہو۔ میں نے شرارتاً منہ بگاڑتے ہوئے کہا۔

دوست، یہ ایک کلرک کا کمرہ ہے۔ واللہ سر گل لاج نہیں ہے

یہاں تو مدد نہیں مل سکتی البتہ سگریٹ مل سکتی ہے ـــــ پیو گے؟
ایک سگریٹ جلا کر میں نے ڈبیا اس کی طرف بڑھا دی۔ لیکن ڈبیا کو میز پر پھینکتے ہوئے اس نے کہا۔
"مذاق نہ کرو ـــــ میں اس وقت قطعی مذاق کے موڈ میں نہیں۔ یہ دل تو پہلے ہی سے دھواں گھر بنا ہوا ہے۔ سگریٹ کیا پیوں!"
میں سب کچھ سمجھ گیا۔ کیونکہ سبھی جانتے ہیں کہ دل میں دھواں کب اور کیوں پیدا ہوتا ہے۔ اسی۔ سے پچھلی ساری تفصیلات۔ پوچھے بغیر ہی میں نے یہ پوچھ لیا۔
"تو پھر کیا ہوا تمھاری محبوبہ کو ـــــ ؟ کیا اس کی شادی کسی اور سے ہو رہی ہے۔ یا اس کے دشمنوں کا مزاج . . . . ."
اس نے حیرت سے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔
"تمھیں کیسے معلوم کہ میری کوئی محبوبہ ہے۔ میں نے تو ابھی تمھیں نہیں بتایا۔"
اپنی قیافہ شناسی کی تعریف سُن کر ایک لمحہ کے لئے ایک ارتعاش آگیں مسرت سے میرا دل کھل اٹھا۔ اگرچہ کہ یہ ایک بہت ہی ادنیٰ قسم کی قیافہ شناسی ہے۔ لیکن موقتی طور پر میں اپنے آپ کو ایسا قیافہ شناس سمجھنے لگا جس نے اس کو ایک علم کی طرح باقاعدگی سے سیکھا ہو میں نے ذرا اینٹھتے ہوئے کہا۔
"ارے میں تو صرف بو سونگھ کر بتا سکتا ہوں کہ کون لڑکا یا لڑکی عشق کے آزار میں مبتلا ہے۔ عشق تو اپنا آپ پروپگنڈسٹ ہوتا ہے۔"

وہ کچھ بھونڈے انداز میں شرما گیا۔ یہ عاشق و معشوق جب شرماتے ہیں تو بڑی مضحکہ خیز ہو جاتی ہیں ان کی صورتیں ـــــ شہاب کی صورت دیکھ کر تو میں ہنسی بھی ضبط نہ کر سکا۔ شہاب بھی ہنسنے لگا۔ ایسے جیسے کوئی آدمی منظرِ عام پر ننگا ہو جانے سے پہلے تو گھبرا جاتا ہے۔ چھپنے کے لئے کونے ڈھونڈھتا ہے اور پھر کوئی راہِ فرار نہ پا کر ڈھٹائی سے اپنے تماشائیوں پر ہنسنے لگتا ہے۔ لیکن یہ ہنسی جلد ہی غائب ہو گئی اور اس نے مجھے ڈانٹ پلائی۔

"ہنومت ـــــ میں اس وقت تم سے بہت ضروری مشورہ کرنے آیا ہوں"

مجھے عورت اور مرد کی محبت پر مطلق اعتماد نہیں ہے۔ دو برس پہلے تک میں بھی خدیجہ سے محبت کرتا تھا۔ لیکن آج وہ ایک بلوری محل کی بیگم ہے۔ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ غریب سہی پر تیرے لئے سماج کے سارے قوانین سے بغاوت کر سکتا ہوں۔ تیرے لئے جیل کی سنگین دیواروں سے بھی سر ٹکرانا مجھے منظور ہے ـــــ مگر خدیجہ کے باپ کی آنکھیں بڑی سُرخ سُرخ اور غصیلی تھیں۔ اس کی مونچھیں بڑی گھنی گھنی تھیں۔ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ اس بلوری محل میں میرے کمرے سے بھی چوگنے بڑے چوبیس کمرے ہیں۔ بہت بڑا کمپاؤنڈ ہے جس میں صرف خوشبودار پھولوں کا باغ ہے۔ دو [illegible] ہیں۔ ایک بڑی اور ایک چھوٹی ـــــ صرف دو بیٹیوں [illegible]۔ جس میں خدیجہ [illegible]

اس کے شوہر کے سوائے کوئی میٹھے ہی نہیں سکتا۔

مگر بیچاری خدیجہ بھی تو مجبور تھی۔ کلیو پیٹرا سے لے کر خدیجہ تک ہر عورت کے دل میں یہ فطری خواہش ہوتی ہے کہ وہ زمین کے زیادہ سے زیادہ خطے پر حکومت کرے۔ اگر وہ میرے ایک کمرے کو چوبیس کمروں والے بلوری محل پر ترجیح دیدیتی تو شاید ساری نسوانیت کے تاریخی وقار کو صدمہ پہنچتا۔

سگریٹ کے کش کے ساتھ باوجود ضبط کے ایک لمبی آہ نکل ہی گئی اور شہاب نے پوچھا۔

تم خاموش کیوں ہو گئے کیا تم میری مدد نہ کروگے؟"

میں نے پرانی یاد کے کریدے ہوئے زخم کو ہتھیلی سے سہلاتے ہوئے کہا۔

"میں ضرور تمھاری مدد کروں گا اس طرح چپ چاپ میں تمھارے ہی متعلق سوچ رہا تھا تمھاری مدد کا ایک بڑا ہی اچھا طریقہ میں نے ڈھونڈا ہے۔"

شہاب نے کہا۔

"مگر تم نے تو پوری بات سنی ہی نہیں"

محبت کے میدان کے پرانے کھلاڑی کی طرح میں نے کہا۔

"پوری بات سننے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ تم یہی کہوگے کہ میں جس لڑکی سے محبت کرتا ہوں۔ وہ اب ایک ایسے شخص کے حوالے کی جارہی ہے۔ جو کسی صورت میں بھی اس کے لئے موزوں نہیں ہے۔ وہ یا تو کوئی بوڑھا

سرمایہ دار ہے یا کوئی ادھیڑ عمر کا رنڈوا یا پھر کوئی آوارہ نوجوان جو خوب شراب پیتا ہے اور پاؤڈر و لپ اسٹک سے لپی پتی بازاری عورتوں کا دلدادہ ہے۔
لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ہر عاشق اپنے رقیب کے بارے میں یہی رائے رکھتا ہے اور اگر برا نہ مانو تو کہوں کہ تمہارے بارے میں بھی میری یہی رائے ہے۔"
شہاب نے تیوری پر بل ڈال کر پوچھا ———
کیا مطلب ———؟
سگریٹ سے دوسرا سگریٹ جلا کر میں نے اطمینان سے کہا۔
"مطلب یہ ہے مائی ڈیر شہاب ——— ! کوئی مرد عورت کو کبھی خوش نہیں رکھ سکتا۔ اس لڑکی کی شادی اگر تم جیسے "تحت اللفظ" سے ہو جائے تو ساری عمر اس کو ایک ساڑی سے دوسری ساڑی نہ پہنا سکو۔ ہر روز فاقے کراتے رہو اور ہر سال بچے پیدا کرتے رہو۔
تم آج اس کے کانوں میں میٹھی میٹھی لمبی لمبی سرگوشیاں کرتے ہو۔ مگر اس سے تمہاری شادی ہو جائے تو اس کو محض اس بات پر ڈانٹ دو گے کہ اس نے سالن میں اتنا نمک کیوں ڈال دیا۔ آج وہ سرخ شلوار میں تمہیں بہت ہی حسین و رنگین نظر آ رہی ہے۔ لیکن کل اسی کمبخت

شلوار کو دیکھ کر تم چیخ اُٹھو گے" ارے میں کہتا ہوں یہ شلوار بدل ڈالو!"

شہاب نے بڑی غصیلی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا بک رہے ہو تم —— میں یہاں تمہاری خرافات تو سننے نہیں آیا تھا!"

میں نے شہاب کے منہ پر سگریٹ کا سارا دھواں اگلتے ہوئے کہا،

"یار —— جب تم غصّے سے سُرخ ہو جاتے ہو تو میرا جی سیب کھانے کو چاہتا ہے۔"

شہاب کھسیانا ہو کر مسکرانے لگا۔

"دیکھو —— میں پھر کہہ رہا ہوں کہ اس وقت قطعی مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں۔"

میں نے بھی مصنوعی سنجیدگی سے جواب دیا۔

"اور میں آج کسی مجبور کی مدد کرنے کے بہت موڈ میں ہوں۔"

شہاب نے گالی دی۔

"تیری ایسی تیسی —— مذاق چھوڑ پہلے پوری بات سن لے۔"

میں نے اس کو اُڑاتے ہوئے کہا۔

ارے ہٹا یار —— کیا پوری بات سنائے گا۔ تو اگر نصیحت نہیں سُن سکتا تو نہ سن —— یہ شہنائی کی آواز سن —— دور سے یہ شہنائی کی آواز کتنی میٹھی میٹھی لگ رہی ہے۔

میرے پیارے دوست تیری محبوبہ بھی شہنائی کی آواز ہے۔ اس کو دور ہی سے سن۔ قریب آجانے پر بڑی کرخت ہو جائے گی یہ آواز مائی ڈیر شہاب ۔۔۔ محبت بھی فاصلے کی پابند ہوتی ہے۔ حسن کا بھی فاصلے سے بڑا لگاؤ ہے"

شہاب غصے سے اُٹھ کھڑا ہوا اور گرجنے لگا۔

"تم میرا مذاق اڑا رہے ہو۔ یہ مدد ہے۔ میں تمہیں اتنا خود غرض اور کمینہ نہیں سمجھتا تھا"

میں نے شہاب کا راستہ روک لیا۔ اور شہاب ہی کی طرح غراتے ہوئے کہا۔

"شہاب ۔۔۔ آج میں تمہیں یہاں سے اس وقت تک نہ جانے دوں گا جب تک کہ تم اپنی محبوبہ کو بھول جانے کا عہد نہ کرو۔ یہ محبت نہیں۔ بلکہ دیس کی جوانی کا گھن ہے۔ دراصل تم خود غرض اور کمینے ہو۔ صرف ایک ہی لڑکی کے عشق میں تم ساری انسانیت سے دغا کر رہے ہو۔ تمہارا دل اتنا تنگ۔ کیوں ہے کہ اس میں ایک ہی لڑکی سما سکے اپنے دل کو اتنا وسیع کرو کہ اس کی پہنائیوں میں چالیس کروڑ انسان سما سکیں۔ اعلیٰ ترین محبت یہی ہے ۔۔۔"

شہاب نے میری قمیص کا کالر پکڑ کر کہا۔

ہٹ جاؤ میرے راستے سے ۔۔۔ مجھے تم جیسے پاگلوں کی

بکواس کی ضرورت نہیں!"

میں نے اس کے دونوں شانے مضبوط پکڑ کر کہا۔

شہاب! تم دیکھ رہے ہو۔ میرا قد چھ فٹ ایک انچ ہے میرے سینے کی چوڑائی ۳۵ انچ ہے۔ میرے کنوارے گول گول بازوؤں میں تم جیسے چار شہاب کو روکنے اور سنبھالنے کی قوت ہے۔ تم یہاں سے نہیں جاسکتے عہد کرو کہ تم اپنی محبوبہ کو بھول جاؤ گے۔ میرے ڈارلنگ دوست! یہ وقت سُرخ عروسی شیروانی پہننے کا نہیں ہے جب کہ ساری انسانیت لہو میں نہا رہی ہے۔ تمہاری محبوبہ کی کاکلیں تو اب بھی سنواری ہوئی ہیں۔ لیکن ادھر بسورتی ہوئی انسانیت کی زلفوں میں کتنے الجھیڑے پڑ گئے ہیں۔"

شہاب نے چڑ کر مجھے دھکیلنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

ہٹ جاؤ ——— ورنہ میں تمہارے منہ پر گھونسہ لگا دوں گا"

میں نے کڑی کڑی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"تم گھونسہ لگاؤ گے ——— اپنی محبوبہ کو حاصل کرنے کے لئے مدد مانگتے پھر رہے ہو سورما! ارے عشق تو ایک طاقت کا نام ہے۔ مگر تمہارا وزن صرف ایک سو بارہ پاونڈ۔ تم اپنی محبوبہ کے والدین سے ڈرتے ہو۔ چوراہے پر کھڑے ہوئے پولیس کے سپاہی سے ڈرتے ہو۔ عدالت کے

کٹہرے سے ڈرتے ہو۔ اور پھر گھونسہ لگانے کا بھی دعویٰ کرتے ہو سورما!

شہاب ——— یہ محبت نہیں ہے۔ بلکہ اس لڑکی کے نرم وگداز چمکیلے جسم میں جو نسوانی مقناطیسیت ہے وہ تمہیں اپنی طرف کھینچ رہی ہے۔ ایک طرح کا جنسی تلذذ تمہیں اس کی طرف دھکیل رہا ہے۔ میرے ہم جلیس! اگر محبت ہوتی تو نارِ نمرود میں کود جانے والی ابراہیمیت تم میں پیدا ہوتی۔ تم عقل و خرد کی گھاٹیوں میں یوں آوارہ نہ پھرتے ——— مجھ جیسے افلاطون سے صلاح مشورہ نہ کرتے۔

ذرا اپنے تاریخ ماضی میں تو جھانکو۔ وہ دیکھو راجہ پرتھوی راج ہزاروں دشمنوں کے مجمع سے چوہان شہزادی کو کس بہادری سے اڑائے لئے جا رہا ہے۔ میرے بیوقوف دوست ——— تالیاں بجاؤ تالیاں۔۔۔۔"

اور شرارتاً میں نے شہاب کے پھولے پھولے گال تھپتھپا دیئے اور وہ جھنیپ کر کرسی میں دھنس گیا۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اب تم واقعی شہاب ہو۔ میرے سعادت مند دوست محبت کیں خون کی روانی اتنی ہی تیز ہوتی ہے کہ تم بار بار غصّہ میں اُٹھ کھڑے ہو جاتے ہو۔ اب دیکھو اس کرسی پر کھسیانے بلّے کی طرح بیٹھے ہوئے کیسے دلچسپ نظر آ رہے ہو

اجازت دو تو تمہاری ایک تصویر اسی پوز (POSE) میں کھینچ لوں۔ اور تمہاری محبوبہ کے پاس بھیجدوں۔ مگر شاید لڑکیاں کھسیانے پن کو پسند نہیں کرتیں ——— !"

شہاب ہنسی نہ روک سکا۔ اور میں نے تکئیے کے سہارے نیم دراز ہو کر دو سگریٹ ایک ساتھ جلائے اور ایک شہاب کی انگلیوں میں تھمادیا اس نے سگریٹ کا ایک لمبا کش کھینچتے ہوئے کہا۔

آج تم اتنی بکواس کیوں کر رہے ہو؟"

میں نے جواب دیا۔

"آج تعطیل ہے۔ اور میں ایک ہندوستانی ہوں۔ گفتار کا غازی ——— لیکن میں بکواس تو نہیں کر رہا۔ شہاب تم ہی کہو کہ تمہاری محبوبہ کو کیا حق ہے کہ قوم کے ایک نوجوان سپاہی کو میدانِ جنگ کے بجائے اپنی گداز آغوش کا لالچ دے۔ مستقبل کے سوداگر کو اپنی زلفوں کے گھنیری چھاؤں میں میٹھی نیند سلا دے۔ ہماری آنکھوں کے آگے کوہ نور چمک رہا ہے۔ لیکن یہ لڑکیاں بیچ میں اپنے رنگ برنگے آنچل کیوں پھیلا دیتی ہیں؟"

سگریٹ کے نشے نے شاید شہاب کو بھی انسپائر (INSPIRE) کر دیا تھا۔

تمہارا خیال غلط ہے۔ عورت اگر دوش بدوش ہو تو ہم

کو وہ نور کیا آسمان کے تارے بھی . . . . . . "
مجھے گدگدی ہوئی اور میں ہنس پڑا۔
"یہ آسمان کے تارے توڑنے کی بھی خوب رہی۔ ہر انسان آسمان کے تارے توڑ لاتا رہا ہے۔ لیکن نئے نئے انسانوں کے ساتھ ساتھ نئے نئے تارے بھی آسمان پر نمودار ہوتے رہے ہیں۔ نہ انسان ختم ہوتے ہیں نہ تارے —— میرے قنوطی ہونے کی بڑی وجہ شاید یہی ہے"
شہاب نے مجھ پر چوٹ کی۔
"مگر میری محبوبہ تمہاری خدیجہ کی طرح نہ جاہل ہے نہ ڈرپوک"
شہاب کا یہ جملہ جیسے میرے دل میں چبھا۔ اور میں نے تڑپ کر کہا۔
"میں کہتا ہوں اس دیس کی ہر لڑکی خدیجہ ہے اپنے والدین کی سُرخ سُرخ آنکھوں اور گھنی گھنی مونچھوں سے ڈرنے والی۔ باہر گلی میں بندوق کی آواز سن کر اپنے شوہر کو اپنی باہوں میں قید کر لینے والی۔ اپنے آنسوؤں سے اپنے شوہر کے دل کو گھول گھول کر نرم اور کمزور بنانے والی ——
یہ عورتیں اگر دوش بدوش ہوں تو پھر اپنی سلامتی ہی خطرے میں پڑ جائے"
شہاب نے اکڑ کر کہا۔
پہلے اس سے میری شادی ہو جانے دو۔ پھر میں تمہیں قائل

کرا دوں گا کہ زندگی کے راستے پر عورت کا دوش بدوش ہونا
کتنا ضروری ہے۔ اچھا اب میں جاتا ہوں ـــــ وہ جانے
لگا اور میں غصے سے پلنگ پر اُٹھ بیٹھا چیخ پڑا۔ ٹھہرو کہاں
جاتے ہو۔ پہلے اقرار کرو کہ جب تک دھرتی ماتا کا کلیں نہ سنور
جائیں تم اپنی محبوبہ کی مانگ میں سہاگ کی افشاں نہ بھروگے۔
ٹھہر! اسے کمینے خود غرض مردود "
شہاب نے دور سے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔
"تھینک یو فار دی کامپلیمنٹس یو کریزی "

THANKYOU FOR THE COMPLIMENTS YOU CRAZY.

× × × × × ×

اس ملاقات کے چند مہینوں بعد ایک شام عابد روڈ پر پھولوں سے
لدی پھندی ایک سُرخ رنگ کی موٹر بیسیوں براتیوں کے ہجوم میں کچھوے
کی طرح رینگ رہی تھی۔ پھولوں کے سہرے میں مجھے شہاب کی موٹی بھدی
ناک نظر آئی۔ میں نے موٹر کے قریب جاکر شہاب کے کان میں کہا۔
"اُس سہرے میں تو بالکل بو بو معلوم ہو رہا ہے تو ـــ
اچھا بتا تو نے مجھے دعوت کیوں نہیں دی ـــــ!"
شہاب نے میرے بازو میں چٹکی لیتے ہوئے کہا۔
"کسی سے میں نے سنا تھا کہ تو مر گیا ہے!"
میں نے گہری سانس میں جواب دیا۔

"اچھا ——— اب کچھ ہی دن انتظار کر ——— تجھے معلوم ہو جائے گا کہ دراصل کون مر گیا ہے"
شہاب نے بات بدلنے کی خاطر کہا۔
"اچھا رات گھر آنا ——— بریانی ملے گی کھانے کو"
میں نے پیٹ سہلاتے ہوئے ایک مصنوعی ڈکار لیتے ہوئے کہا۔
"مجھے تو بھوک نہیں ہے۔ کہو تو اپنے پالتو کتے کو بھجوادوں"
اور پھر میں براتیوں کے ہجوم سے نکل کر فٹ پاتھ پر آگیا۔

× × × × × ×

پھر چھ مہینے اور گزر گئے۔ ایک دن شہاب پھر ملا۔ میں نے پوچھا۔
"تم اور تمھاری تعلیم یافتہ بیوی ایک دوسرے کے دوش بدوش ہر رات کتنے ستارے توڑ لاتے ہو آسمان سے ——— !"
اس نے جھینپتے ہوئے کہا۔
"اور تین مہینے ٹھہر جاؤ ——— ایک بڑا ہی پُر نور ستارہ طلوع ہونے والا ہے"

× × × × × ×

تین مہینے اور گذر گئے۔ شہاب کے گھر وہ پرنور ستارہ طلوع ہوا اور میں دعوت میں بریانی کھائی۔ اس کے بعد سے شہاب کے گھر روز جانے لگا۔ ستارہ کیا طلوع ہوا۔ شہاب کے چہرے کی روشنی ماند پڑنے لگی۔ جب دیکھو جھلایا ہوا چڑچڑا۔ بدمزاج ——— میں چونکہ روز

شہاب کے گھر جانے لگا تھا اسی لئے روز نئے نئے قصے بھی مجھے معلوم ہونے لگے ——— یہی شہاب جو کہتا تھا کہ مجھے دنیا میں صرف اپنی محبوبہ کے کان میں لمبی لمبی سرگوشیاں کرنے کا مشغلہ پسند ہے اب چار چار روز تک اس سے بات نہیں کرتا تھا۔ وہ سبز ساڑھی باندھتی تو وہ اسے نیلی ساڑی پہننے کو کہتا۔ وہ سُرخ شلوار پہنتی تو وہ چلّا اُٹھتا۔ "ارے میں کہتا ہوں یہ شلوار بدل ڈالو ———!"

× × × × × ×

لیکن ایک دن میں نے سنا کہ اس کی بیوی نے آلو کے سالن میں بہت زیادہ مرچ ڈال دی تھی۔ اور اس کے منع کرنے کے باوجود سُرخ شلوار پہنی تھی۔ اور شہاب نے آپے سے باہر ہو کر اسے اتنا پیٹا تھا کہ وہ میکہ چلی گئی تھی۔

تمام دوستوں کا خیال ہے کہ اس کی بیوی تعلیم یافتہ ہونے کے علاوہ بڑی ضدی اور مغرور ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اس کے میکہ چلے جانے سے اس کا حُسن پھر عود کر آجائے گا۔ وہ از سرِ نو جوان ہو جائے گی وہ میلی کچیلی پھیکے رنگ کی شلوار ہی کیوں نہ پہنے شہاب ایسا محسوس کرے گا جیسے شہنائی کہیں دور بج رہی ہے۔

———— ✢ ————